

اسلام کے سچے واقعات



تحریر: زاہد عرفان میاں

اسلام کے سچے واقعات

تاریخ اسلام سے لئے گئے سچے واقعات

تحریر:

زاہد عرفان میاں

کتاب کی اشاعت ممنوع ہے

کتاب کو حوالہ جات کیلئے استعمال کیا جاسکتا ہے

اس کتاب کی اشاعت راہِ ہدایت کی جانب سے پہلی بار کی جارہی ہے۔

کتاب کے جملہ حقوق بحق راہِ ہدایت پبلیکیشنز محفوظ ہیں



شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے

وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا

اور اللہ پر ہی بھروسہ رکھنا ، اور اللہ ہی کارساز کافی ہے

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضامین کی ترتیب	صفحہ نمبر
	ابتدائی کلمات	5
1	طوفانِ نوح اور مومنہ عورت	6
2	شہاد بن عادی کی جنت اور اُس کا انجام	8
3	حضرت لقمان کی سبق آموز نصیحت	11
4	اُمتِ موسیٰ علیہ السلام کا بدترین اور اعلیٰ ترین شخص	13
5	ایک مومنہ کا جنت میں محل	15
6	عاشقِ رسول اللہ محمد ﷺ	18
7	اُم المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ایثار	21
8	غلامِ صحابی رسول ﷺ اور شہید	23
9	ایک مجوسی کا صاحبِ ایمان ہونا	26
10	حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سخاوت	28
11	خلیفۃ المسلمین حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ	30
12	عدلِ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ	34
13	حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رعایا سے برتاؤ	38
14	ایک بمیثالِ مسلمان خلیفہ	40
15	خلیفۃ المسلمین کا رعایا سے سلوک	42
16	حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایمان	44
17	خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سادگی	46
18	اللہ تو دیکھ رہا ہے	47
19	جذبہٴ جہاد اور اللہ کا انعام	49
20	حضرت عمر بن عبدالعزیز	55
21	خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا انصاف	57

22	خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی سادگی	63
23	شُکرائہِ نعمت ادا کرو	65
24	اللہ پر توکل	66
25	حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ اور بچے کی دلیل	68
26	خلیفہ ہارون الرشید کا متقی بیٹا	69
27	زبیدہ خاتون اور بن دیکھے کا سودا	75
28	احسان کا بدلہ	77
29	عظیم فاتح جرنیل سلطان صلاح الدین ایوبی	81
30	سندباد جہازی کا سمندری سفر	87
31	متقی حکمران سلطان شمس الدین التمش	92
32	ہلاکو خان کی بیٹی کا سوال اور عالم کا جواب	93
33	جب جزائرِ مالدیپ میں اسلام کا سورج چمکا	95
34	حاکم وقت انصاف کی عدالت میں	98
35	امیر البحر خیر الدین پاشا باربروسا	100
36	فرید خان شیر شاہ سوری ایک بمیثال حکمران	103
37	جامع مسجد دہلی کی نیلامی	108
38	مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر	109
39	مسلمان حکمران کی محبت رسول اللہ ﷺ	111
40	کسین عاشق رسول اللہ (ﷺ)	114
41	ایک بھکاری کا ایمان	116
42	ایک مومن کی استقامت پر عورت کا مسلمان ہو جانا	117
43	ڈاکٹر علامہ سر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ	121
44	قائد اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ	123
45	قیام پاکستان اور محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ	126

ابتدائی کلمات

تاریخ اسلام کے واقعات اسلامی تاریخ کی مختلف کتابوں سے لئے گئے ہیں۔ ان واقعات کو میں نے اپنے انداز میں تحریر کیا ہے۔ واقعات کی نوک پلک سنوارنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ طرزِ تحریر سے واقعات کا سیاق و سباق نہیں بدلا۔ یہ واقعات اسلام کے مختلف ادوار کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ ادوار اللہ تعالیٰ کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں اپنی مخلوق کو طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا۔ تاریخ کے ادوار میں انسان کی تربیت کیلئے سبق موجود ہے۔ تاریخ ایک کتاب کی مانند ہے جس میں ہر زمانہ ایک باب ہے۔

اسلامی تاریخ ہزار ہا دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ہر نبی کا زمانہ عہدِ اسلام کہلاتا ہے جب ایک نبی کے بعد اللہ تعالیٰ دوسرا نبی معبوث فرماتے تھے تو پہلے نبی کی اُمت کو اُس کی پیروی کرنا پڑتی تھی، جو لوگ ایسا نہیں کرتے تھے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتے تھے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے آخری نبی بنا کر بھیجا اور اُمتِ محمد ﷺ کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ روزِ قیامت تک عہدِ اسلام میں ہی رہے گی۔ زمانہ قدیم میں لکھی گئی تاریخ اسلامی مورخین کی سخت محنت کا نچوڑ ہے۔ اُس زمانے میں چونکہ بہت زیادہ لٹریچر نہیں لکھا جاتا تھا اور لکھا ہوا لٹریچر بھی زمانے کی مطابقت سے اتنی آسانی سے دستیاب نہیں تھا۔ لکھنے اور اشاعت کے عمل میں بھی بہت زیادہ سہولیات میسر نہیں تھیں اس لئے مورخین لکھتے وقت واقعات کے تسلسل کو برقرار نہیں رکھ پاتے تھے۔ اگر ایک عام قاری تاریخ کا مطالعہ کرے تو وہ واقعات میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ میں بھی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہوں تو بار بار مجھے تسلسل کو برقرار رکھنے کیلئے ورق گردانی کرنی پڑتی ہے، مگر پھر بھی زمانہ کی سہولیات کے مطابق ان عظیم مورخین کی کوششیں قابلِ تحسین ہیں۔ اس کتاب میں لکھے گئے واقعات کی نوک پلک سنواری گئی ہے مگر سیاق و سباق کو برقرار رکھا گیا ہے۔ میری کوشش ہے کہ میگزین راہِ ہدایت میں مستقل عنوان کے تحت لکھے گئے مضامین کو کتابوں کی صورت میں اپنی ویب سائٹ پر شائع کروں۔ اپنی مالی حیثیت کی بنا پر میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں انہیں کتابی صورت میں شائع کروں۔ جلد ہی ہماری ویب سائٹ پر بلاگ کی سہولت بھی میسر ہوگی تاکہ ادارہ آپ لوگوں کی قیمتی آراء سے بھی مستفید ہو سکے۔ فی الحال آپ اپنی تجاویز مجھے ای میل کر سکتے ہیں۔ میں اپنی پہلی کاوش پر آپ کی تجاویز کا منتظر رہوں گا۔

آپ کی دُعاؤں کا طالب

زاہد عرفان میاں

E-Mail: seratulmustaqeem@gmail.com

طوفان نُوح اور مومنہ عورت

حضرت نُوح علیہ السلام جب قوم سے مایوس ہو گئے تو اللہ تعالیٰ سے دُعا کی:

اور پھر نُوح نے یہ دُعا کی کہ اے میرے پروردگار ان کافروں میں سے کسی کو زمین پر بستانہ رہنے دے۔ اگر تو ان کو رہنے دیگا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان سے جو اولاد ہوگی وہ بھی بدکار اور ناشکری ہوگی۔ اے پروردگار! مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور جو ایمان لا کر میرے گھر میں آئے۔ اس کو اور تمام ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو معاف فرما۔ اور ظالم لوگوں کیلئے اور زیادہ تباہی بڑھا۔ ﴿نوح۔ آیت 26-28﴾ جب حضرت نُوح علیہ السلام نے اپنی قوم کیلئے بددعائیں کیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں کشتی بنانے کا حکم دیا۔

اور ایک کشتی ہمارے حکم سے ہمارے سامنے بناؤ۔ اور جو لوگ ظالم ہیں ان کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ کہنا کیونکہ وہ ضرور غرق کر دیئے جائیں گے۔ ﴿ہود۔ 37﴾

حضرت نُوح علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے کشتی بنانا شروع کی تو ان کی قوم کے لوگوں نے مذاق اڑانا شروع کر دیا کہ اے نُوح (علیہ السلام)! یہاں نہ دریا اور نہ سمندر، تم یہ کشتی کیوں بنا رہے ہو؟ حضرت نُوح علیہ السلام نے فرمایا! یہ کشتی میں اللہ کے حکم سے بنا رہا ہوں، جب اللہ چاہے گا قوم پر عذاب نازل فرمائے گا۔ حضرت نُوح علیہ السلام کشتی بناتے رہے اور لوگ مذاق اڑاتے رہے۔

ایک دن حسبِ معمول حضرت نُوح علیہ السلام کشتی بنانے میں مصروف تھے کہ ایک بوڑھی عورت اُنکے پاس آئی، یہ عورت حضرت نُوح علیہ السلام کے مومن ساتھیوں میں سے تھی اور شہر سے باہر تھوڑے فاصلے پر ایک جھونپڑی میں رہتی تھی۔ وہ بولی: اے نُوح (علیہ السلام)! تم یہ کشتی کیوں بنا رہے ہو؟ آپ نے فرمایا: اے بڑی بی! میں یہ کشتی اللہ کے حکم سے بنا رہا ہوں۔ بہت جلد اللہ کی طرف سے ایک بہت بڑا طوفان آنیوالا ہے، جس میں سب کافر ہلاک ہو جائیں گے اور مومن لوگ اس کشتی میں سوار ہو کر بچ رہیں گے۔

مومنہ بڑھیا بولی: اے نُوح! جب طوفان آنے لگے اور تم مومن لوگوں کو کشتی میں سوار کرنے لگو تو مجھے بھی خبر کر دینا تاکہ میں بھی آپ کیساتھ کشتی میں سوار ہو سکوں۔ حضرت نُوح علیہ السلام نے ایسا کرنے کا وعدہ کر لیا۔

جب حضرت نُوح علیہ السلام نے کشتی بنالی تو اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا:

یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آپہنچا اور تنور جوش مارنے لگا۔ تو ہم نے نُوح کو حکم دیا کہ ہر قسم کے پالتو جانوروں میں سے جوڑا جوڑا یعنی ایک ایک نر اور ایک ایک مادہ لے لو اور جس شخص کی نسبت حکم ہو چکا ہے کہ ہلاک ہو جائیگا اس کو چھوڑ کر اپنے گھر والوں کو اور جو ایمان لایا ہو اس کو کشتی میں سوار کر لو اور ان کے ساتھ ایمان بہت ہی کم لوگ لائے تھے۔ ﴿ہود۔ 40﴾

جب حضرت نُوح علیہ السلام لوگوں کو کشتی میں سوار کرنے لگے تو مومن بُڑھیا سے کیا ہوا وعدہ بھول گئے۔ جب سب مومن اور چرند و پرند کشتی میں سوار ہو گئے تو اللہ کے حکم سے زمین نے پانی اُگلنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی آسمان سے مینہ بھی برسنا شروع ہو گیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پانی پہاڑ جو دی کی چوٹیوں سے بھی اوپر چلا گیا۔ کشتی میں سوار ہونیوالوں کے سوا سب انسانوں، جانوروں اور پرندوں کو پانی کے اس عظیم طوفان نے نگل لیا، جن میں حضرت نُوح علیہ السلام کی بیوی اور بیٹا بھی شامل تھے۔ کشتی جب پہاڑ جو دی کی چوٹی پر رُک گئی تو حضرت نُوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے رحم کی درخواست کی۔ چنانچہ طوفان رُک گیا اور زمین نے پانی اُگلنا شروع کر دیا۔ کچھ روایات میں پانی خُٹک ہونے میں چالیس دن اور کچھ میں یہ مدت پانچ ماہ بیان کی گئی ہے۔

حضرت نُوح علیہ السلام اور مومنین پھر سے آباد ہو گئے۔ ایک روز وہ مومن بُڑھیا آپ کے پاس آئی اور کہنے لگی: اے نُوح! وہ پانی کا طوفان کب آئیگا؟ میں ہر روز آپ کے پیغام کی منتظر رہتی ہوں کہ میں بھی آپ کیساتھ کشتی میں سوار ہو سکوں؟

حضرت نُوح علیہ السلام نے فرمایا: اے میری قوم کی مومن عورت! میں تجھے بتانا بھول گیا تھا۔ طوفان تو کب کا آچکا اور اللہ نے اپنے مومن بندوں کو کشتی کے ذریعے بچا لیا۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ تو اُس کشتی میں سوار نہیں تھی تو زندہ کیسے بچ گئی؟

عورت نے عرض کی: اے نُوح! جس اللہ نے کشتی میں سوار لوگوں کو بچایا، اُسی نے مجھے میری ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کے ذریعے بچا لیا۔

بیشک اللہ جو چاہتا ہے وہی کچھ ہوتا ہے۔ اللہ اپنے بندوں کی ہر حال میں مدد فرماتا ہے۔ (تفسیر، رُوح البیان)

شہاد بن عاد کی جنت اور اُس کا انجام

عاد نامی شخص حضرت ہود علیہ السلام کے دور میں حکمران تھا۔ عاد کا نسب عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح ہے۔ عاد کے دو بیٹے شدید اور شہاد تھے۔ یہ دونوں ہفت اقلیم کے بادشاہ تھے۔ یوں تو دونوں کی بڑی شان و شوکت تھی لیکن شہاد زیادہ رُعب اور دبدبے والا تھا۔ اُس وقت کے تمام بادشاہ اُس کے مطیع اور فرمانبردار تھے۔ شدید تو سات سو برس تک بادشاہت کر کے چل بسا۔ اب شہاد ہی واحد حکمران تھا۔ وہ ایک انصاف پسند حکمران تھا مگر کفر اور شرک میں مبتلا تھا۔

حضرت ہود علیہ السلام نے شہاد کو دعوتِ حق دی تو وہ بولا:

اگر میں تمہارا دین قبول کر لوں تو مجھے کیا حاصل ہو گا؟

حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ تمہیں اس کے بدلے میں بہشتِ جاودانی میں داخل فرمائیں گے۔ اور بہت سے انعامات سے نوازیں گے۔

شہاد بولا: اے ہود! تو مجھے جس جنت کا لالچ دے رہا ہے میں ایسی ہی جنت اس دنیا میں بنالوں گا اور دن رات اس میں عیش کروں گا۔ مجھے تمہارے خدا کی جنت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

شہاد نے ہر ملک میں بادشاہوں کو یہ پیغام بکھوایا کہ مجھے ایک ایسا قطعہ زمین چاہیے جو بالکل ہموار ہو اور اُس میں کوئی نشیب و فراز نہ ہو۔ آخر کار اُسے خطہ عرب میں ایک قطعہ زمین مل گیا جس کی مسافت چالیس فرسنگ (ایک فرسنگ یا فرسخ تین میل کا ہوتا ہے) تھی۔ شہاد نے اپنے زیر تسلط ملکوں سے تین ہزار بہترین پیمائش کار منگوائے جن میں ہر ایک کے ساتھ ایک سو بہترین کاریگر تھے۔ شہاد نے جنت کی بنیادوں میں سنگ مرمر ڈلوایا اور دیواروں میں سونے چاندی کا استعمال کیا۔ ستونوں، فرشوں اور چھتوں میں زُمرّد، یاقوت اور زبرجد کا استعمال کیا گیا جبکہ سنگریزوں کی جگہ آبدار موتی بچھائے گئے۔ شہاد کی جنت بہت سے محلات پر مشتمل تھی۔ ہر ایک محل کے ارد گرد دودھ، شراب اور شہد کی نہریں بنائی گئیں جن میں جواہرات کا استعمال کیا گیا۔ جنت میں سونے اور چاندی کے درخت بنوائے گئے جن کی پتیاں زُمرّد سے بنائی گئیں اور درختوں کی ڈالیاں سُرخ یاقوت سے بنائی گئیں۔ بہشت کی زمین پر خاک کی جگہ مشک و عنبر اور زعفران ڈالا گیا اور موتی اور مونگے ڈالے گئے۔ جنت کے دروازے پر چار خوبصورت میدان بنائے گئے جن میں میوہ دار درخت لگائے گئے اور ہر میدان میں ایک ایک لاکھ سونے اور چاندی کی کرسیاں بچھائی گئیں اور ان کے سامنے ہزار ہا اقسام کے خوان رکھے گئے غرض کہ شہاد نے جو کچھ بھی جنت کے متعلق سُن رکھا تھا بنا ڈالا۔ کچھ تاریخ دان جنت کی تعمیر کا عرصہ بارہ سال بیان کرتے ہیں جبکہ کچھ تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ اسے بنانے میں تین سو سال کا عرصہ لگا (واللہ اعلم)۔

دورانِ تعمیر شداد نے ہر طرف اپنے کارندے بھجوائے کہ جنت کیلئے ہر کسی سے زر و جواہر ت چھین لئے جائیں۔ ہر کاروں نے ایک بڑھیا سے اُس کی یتیم بیٹی کے گلے کا ہار بھی چھین لیا جس میں ایک درہم مالیت کی چاندی تھی۔ لڑکی نے رو کر فریاد کی کہ یہ ہار میری تمام دولت ہے یہ مجھے بخش دو مگر کسی نے اُس کی فریاد نہ سنی۔

لڑکی نے رو کر بارگاہِ الہی میں دُعا کی:

اے اللہ! تو ہی انصاف کر نیوالا ہے تو مظلوموں کو اس ظالم کے شر سے بچا اور اس ظالم سے چھٹکارا نصیب فرما۔

جنت کی تعمیر مکمل ہو چکی تو شداد نے حسین لڑکوں اور لڑکیوں کو جمع کرنے کا حکم دیا۔ پھر انہیں بہشت میں خوروں اور غلاموں کے طور پر خدمت کیلئے مامور کیا۔ روایت ہے شداد کو اپنی بنائی ہوئی جنت میں دس سال تک جانا نصیب نہ ہوا۔ پھر ایک دن اپنے غلاموں کیساتھ بہشت کو دیکھنے گیا۔ دروازے کے قریب پہنچا تو اپنے تمام غلاموں کو چاروں میدانوں میں بھیج دیا اور خود ایک غلام کیساتھ اپنی خود ساختہ بہشت کے دروازے کی جانب بڑھا اور جب وہ دروازے تک پہنچا تو دیکھا ایک شخص وہاں کھڑا ہے۔ شداد کو بڑی حیرت ہوئی۔

اُس نے پوچھا:

اے شخص! تو کون ہے اور یہاں تیرا کیا کام؟

وہ شخص بولا: "میں ملک الموت ہوں اور تیری روح قبض کرنے آیا ہوں"

ملک الموت کا جواب سن کر شداد بولا: "تم مجھے کچھ مہلت دو تا کہ میں اپنی بنائی ہوئی بہشت کو دیکھ سکوں"

ملک الموت نے کہا: "اللہ کا حکم نہیں ہے کہ تو اپنی بنائی ہوئی جنت میں جائے کیونکہ تجھے تو جہنم کا ایندھن بننا ہے"

ملک الموت کا جواب سن کر شداد طیش میں آگیا اور بولا: مجھے گھوڑے سے اترنے دو پھر میں دیکھتا ہوں کہ تم مجھے جنت میں جانے سے کیسے روکتے ہو؟

ملک الموت نے کہا: "تمہارے لئے اتنی مہلت بھی نہیں ہے"

یہ سن کر شداد گھوڑے سے نیچے اترنے لگا۔ اُس ایک پاؤں جنت کے دروازے پر اور دوسرا گھوڑے کی رکاب میں تھا کہ آسمان سے ایک ہولناک آواز

آئی اور شداد کی روح قبض کر کے اُسے واصل جہنم کر دیا گیا۔ آسمان سے آنیوالی آواز اس قدر ہولناک تھی کہ شداد کے تمام ساتھی بھی ہلاک ہو گئے

۔ یوں شداد اپنی بنائی ہوئی جنت میں جانے کی حسرت لئے جہنم کا ایندھن بن گیا۔ اللہ کے حکم سے شداد کی بنائی ہوئی جنت کو زمین میں دبا دیا گیا۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ﴿٦﴾ الْفَجْرِ - 6

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے عاد والوں کیساتھ کیا سلوک کیا؟

إِنَّمَا ذَاتَ الْعِمَادِ ﴿٧﴾ الْفَجْرِ - 7

جو ارم کہلاتے تھے اور دراز قد ستونوں کی مانند تھے۔

الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ﴿الفجر-8﴾

کہ تمام ملک میں ایسے پیدا نہیں ہوئے تھے۔

روایت ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ حکومت میں حضرت عبداللہ بن قلابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اونٹ گم ہو گیا۔ دورانِ تلاش اُن کا گذر صحرائے عدن سے ہوا۔ اُنہوں نے وہاں ایک پُر آرائش شہر دیکھا جس میں کوئی مکین نہیں تھا انہیں وہاں سے کچھ جواہرات ملے جو وہ اپنے ساتھ لے آئے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خبر ہوئی تو انہوں نے حضرت کعب احبار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلایا اور دریافت کیا۔

کعب! کیا دنیا میں کوئی ایسا شہر موجود ہے؟

حضرت کعب احبار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

ہاں اس شہر کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے۔ یہ شہر شداد نے جنت کے مثل بنایا تھا مگر یہ قوم عذابِ الہی کا شکار ہوئی اور کوئی بھی زندہ نہ بچا۔ آپ کے زمانے میں ایک مسلمان شخص جس کا قد چھوٹا آنکھیں نیلی اور اُس کے ابرو پر تل کا نشان ہو گا۔ وہ اپنے گمشدہ اونٹ کو تلاش کرتے ہوئے اس ویران شہر میں داخل ہو گا۔

اتنے میں عبداللہ بن قلابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی وہاں آگئے تو انہیں دیکھ کر کعب احبار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

بیشک شداد کی بنائی ہوئی جنت دیکھنے والا شخص یہی ہے۔

حضرت لقمان کی سبق آموز نصیحت

حکیم حضرت لقمان اللہ کے برگزیدہ بندے تھے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے اس بندے سے اتنا پیار تھا کہ قرآن پاک میں اُن کے نام کی پوری سورہ نازل فرما دی۔ حضرت لقمان کے بارے میں ایک خیال تو یہ ہے کہ وہ تاریخ کے بیٹے تھے اور تاریخ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد تھے اس لحاظ سے حضرت لقمان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی ہوئے۔ کچھ مؤرخین کہتے ہیں کہ آپ حضرت ایوب علیہ السلام کے بھانجے تھے اور بعض آپ کو حضرت ایوب علیہ السلام کے خالہ زاد بھائی کہتے ہیں۔ مؤرخین بتاتے ہیں کہ آپ نے ایک ہزار برس عمر پائی اور حضرت داؤد علیہ السلام کا دور پایا اور یہ کہ آپ نے حضرت داؤد علیہ السلام سے علم سیکھا۔

حکیم حضرت لقمان ایک امیر آدمی کے غلام تھے۔ امیر آدمی حکیم حضرت لقمان کو بیچنے کی نیت سے غلاموں کی منڈی میں لے گیا۔ وہاں ایک کسان نے آپ کو خرید لیا اور اپنے گھر لے گیا۔ حکیم حضرت لقمان چونکہ اللہ کے عبادت گزار بندے تھے، اس لئے دن میں اپنے آقا کی خدمت کی اور رات کا وقت اللہ کی عبادت میں گزارنے کیلئے ایک خالی کمرے میں تشریف لے گئے۔ آپ نے نمازِ عشاء ادا کی، دیکھا تو آقا سوچکا تھا۔ آپ نوافل ادا کرنے لگے۔

رات کا ایک پہر بیت چکا تھا آپ آقا کے کمرے میں گئے تو وہ بدستور محو خواب تھا۔ آپ نے اپنے آقا سے کہا: آقا! اُٹھیے اور دوسرے جہان کی نعمتوں سے مستفید ہونے کیلئے اللہ کی عبادت کریں، کیونکہ اللہ نے مومنین کیلئے جنت کو آراستہ کر دیا ہے، جبکہ گنہگاروں کیلئے دوزخ کی آگ بھڑکادی گئی ہے۔ مالک بولا: اے غلام! تم جاؤ اور مجھے سونے دو، میرا رب بڑا غفور اور رحیم ہے۔

حضرت لقمان واپس کمرے میں آکر عبادت میں مشغول ہو گئے۔ رات کا دوسرا پہر بھی بیت گیا اور آقا اب بھی سو رہا تھا۔ آپ پھر آقا کے پاس گئے اور اُسے جگاتے ہوئے بولے: آقا! اب تو رات کا دوسرا پہر بھی بیت چکا اور رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو گئی ہے۔ جو وقت بیت گیا سو بیت گیا مگر باقی ماندہ رات میں ہی سفرِ آخرت کی تیاری کر لیجیئے۔

آقا نے پھر وہی جواب دیا: اے غلام! تم جاؤ اور مجھے سونے دو، میرا رب بڑا غفور اور رحیم ہے۔

حضرت لقمان واپس کمرے میں آکر پھر عبادت میں مشغول ہو گئے۔ رات کا تیسرا پہر بھی بیت گیا اور پرندے اپنے گھونسلوں نکل کر درختوں کی شاخوں پر بیٹھ کر چہچہانے لگے مگر آقا اب بھی سو رہا تھا۔ حضرت لقمان پھر آقا کے پاس گئے اور اُسے ہلاتے ہوئے بولے: میرے آقا! اُٹھیے اب تو پرندے بھی اللہ کی حمد و ثنائیں مصروف ہو گئے ہیں، اچھا وقت ہے، آپ بھی اپنے رب سے کچھ مانگ لیں۔

آقا بولا: اے غلام! مجھے کچھ دیر تو اور سونے دو، میرا رب بڑا شفیق اور مہربان ہے۔

حضرت لقمان واپس کمرے میں آئے اور نمازِ فجر ادا کرنے لگے۔ نماز سے فارغ ہوئے تو اپنے آقا کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ اب صبح ہو چکی تھی اور آقا بھی بیدار ہو چکا تھا۔

صبح کے کاموں اور کھانے سے فراغت ہوئی تو آقا نے حضرت لقمان سے کہا: اے غلام! یہ جو لے جاؤ اور انہیں کھیتوں میں جا کر کاشت کر دو۔ حضرت لقمان نے جو لئے اور پڑوسی سے اُن کے بدلے میں باجرہ لے لیا۔ انہوں نے جا کر کھیتوں میں باجرہ کاشت کر دیا۔ کچھ عرصے بعد باجرہ اُگ کر فصل تیار ہونے کو ہوئی تو آقا حضرت لقمان کو لیکر کھیتوں میں گیا۔ آقا یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ کھیتوں میں تو جو کی جگہ باجرے کی فصل کھڑی ہے۔ آقا بولا: ارے غلام! میں نے تو تجھے جو کاشت کیلئے دیئے تھے پھر یہ باجرہ کیسے اُگ آیا؟

حضرت لقمان بولے: آقا! آپ فکر نہیں کریں۔ اللہ بڑا غفور و رحیم ہے، وہ ضرور کھیتوں میں جو اُگا دے گا۔ آقا حضرت لقمان کی بات سمجھ گیا اور کہنے لگا: لقمان! تو نے دُرست کہا، زمین سے تو وہی نکلے گا جو ہم بوئیں گے۔ جب ہم باجرہ بوئیں گے تو جو کی فصل کیسے تیار ہوگی؟

حضرت لقمان نے فرمایا: آقا! اگر ہم اللہ کی عبادت سے غافل ہو کر نیند میں پڑے رہیں گے تو کیسے اللہ کی رحمت اور مہربانی سے مُستفید ہو کر عابدین اور صالحین کا درجہ پائیں گے؟

اُمّتِ موسیٰ علیہ السلام کا بدترین اور اعلیٰ ترین شخص

ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا: یا الہی! میری اُمّت کا بدترین شخص کون ہے؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: موسیٰ! کل صُبح تم سب سے پہلے جس شخص کو دیکھو گے، وہی تمہاری اُمّت کا بدترین شخص ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب صُبح گھر سے نکلے تو انہیں ایک نفیس لباس والا شخص نظر آیا جو اپنے بیٹے کو کندھے پر بٹھائے ہوئے جارہا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دل میں سوچا۔ اچھا تو یہ میری اُمّت کا بدترین شخص ہے۔ پھر کچھ سوچ کر اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوئے: یا الہی! میری اُمّت کا سب سے اچھا شخص کون ہے؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! آج شام تم سب سے پہلے جس شخص کو دیکھو گے، وہی تمہاری اُمّت کا بہترین شخص ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام شام ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ شام ہوئی تو آپ گھر سے نکلے، آپ کی نظر ایک شخص پر پڑی تو چونک گئے۔ یہ تو وہی شخص تھا، جسے آپ نے صُبح دیکھا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے کلام کیا: اے میرے رب! میں عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ یہ کیا معاملہ ہے کہ ایک ہی شخص بدترین اور بہترین ہو؟ میرے رب! تو ہی میری الجھن کو حل فرما سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! صُبح جب وہ شخص اپنے بیٹے کو کندھے پر بٹھائے جنگل کی طرف جارہا تھا تو بیٹا بولا: ابا جان! کیا یہ جنگل بہت بڑا ہے؟ وہ شخص بولا: ہاں بیٹا! یہ جنگل بہت بڑا ہے۔ بیٹا بولا: ابا جان! کیا اس جنگل سے بڑی بھی کوئی چیز ہے؟

وہ شخص بولا: ہاں بیٹا! جنگل کے پیچھے جو پہاڑ نظر آرہا ہے، وہ جنگل سے بھی بڑا ہے۔ بیٹا بولا: ابا جان! کیا اس پہاڑ سے بڑی بھی کوئی چیز ہے؟

وہ شخص بولا: ہاں بیٹا! جو اوپر حدِ نظر آسمان تم دیکھ رہے ہو، یہ پہاڑ سے بھی بڑا ہے۔ بیٹا بات کو بڑھاتے ہوئے بولا: ابا جان! کیا آسمان سے بڑی بھی کوئی چیز ہے؟

وہ شخص سرد آہ بھرتے ہوئے بڑی دردناک آواز میں بولا: ہاں بیٹا! آسمان سے بھی بڑے تیرے باپ کے گناہ ہیں۔ بیٹا بولا: ابا جان! کیا آپ کے گناہوں سے بھی بڑی کوئی چیز ہے؟

بیٹے کا سوال سُن کر باپ کی نظروں میں ایک چمک سی آگئی اور وہ بولا: ہاں بیٹا! تیرے باپ کے گناہوں سے بھی بڑی بلکہ ہر شے سے بڑی میرے رب کی رحمت اور مغفرت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! جب تم نے صُبح اُس شخص کو دیکھا تو وہ واقعی تیری قوم کا بدترین شخص تھا، مگر جب اُس نے میری رحمت اور مغفرت کو ہر شے سے بڑا مانا، تو مجھے اُس کے دل میں ایمان کی پختگی اور نگاہوں میں شرمندگی نظر آئی تو میں نے اُسے تیری اُمّت کا بہترین شخص بنا دیا۔ میں نے

اُس کے سب گناہ معاف کر دیئے بلکہ گناہوں کو نیکیوں میں بدل دیا۔
عاجزی، اعترافِ گناہ اور اللہ کی عظمت اور رحمت و مغفرت کو عظیم تر ماننا مومن کی نشانی ہے۔

ایک مومنہ کا جنت میں محل

شب معراج میں رسولِ پاک ﷺ ایک خوبصورت اور وسیع و عریض محل پر سے گزرے۔ محل کی معطر فضاؤں نے آپ ﷺ کو حیران کر دیا۔ وہاں کی مسحور کن خوشبوئیں نہ صرف محل کے ماحول کو مہکار ہی تھیں بلکہ گزرنے والوں کو بھی تازگی اور شادابی عطا کر رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا کہ اس کا مکین کون ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ گھر فرعون کے گھر کی نوکرانی اور اُس کے بچوں کا ہے۔ یہ کہتے ہوئے جبرائیل علیہ السلام نے پوری داستان بیان کر دی۔

ماشطہ ایک مومنہ خاتون تھی۔ جو درپردہ ایمان کی دولت سے مالا مال تھی۔ فرعون کے محل میں وہ اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے مزدوری کرنے جاتی تھی۔ چونکہ وہ بہت پاکباز اور دانشمند خاتون تھیں اس لئے عرصہء دراز سے شاہی محل میں ملازمت کرتی تھیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام سے فرعون کی کشمکش جاری تھی۔ جس میں شکست کی وجہ سے فرعون کو خفت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ دونوں بھائیوں کی کامیابیوں نے فرعون کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ اس لئے جب بھی اُسے کسی کے ایمان قبول کرنے کی خبر ملتی تو وہ اُسے خوفناک سزا دیتا۔ کسی کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیتا اور کسی کو تختہء دار پر چڑھا کر اس کے ہاتھ پاؤں میں کیل ٹھونک کر سر عام لٹکا دیتا۔ فرعون کے ان مظالم کے دوران اُس کے ایک خازن، خادمہ اور بیوی آسیہ ایمان قبول کر چکے تھے۔ جب بھی فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام سے زنج ہوتا۔ یہ اہل ایمان دل ہی دل میں خوش ہوتے۔

یہ لوگ اپنی اس خوشی کو پنہاں رکھتے مبادا کہ فرعون کو اس کی بھنک پڑ گئی تو وہ انہیں اپنے عذاب کی بھینٹ چڑھا دیتا۔ فرعون کی خادمہ ایک دن اُس کی نازک مزاج بیٹی کو کنگھی کر رہی تھی کہ اچانک کنگھی اُس کے ہاتھ سے گر گئی۔ کنگھی اٹھاتے وقت میساختہ اس کے منہ سے "بسم اللہ" نکل گیا۔

فرعون کی بیٹی جو بڑی تیز و طرار تھی، چونک گئی۔ اور بولی: یہ اللہ کون ہے؟

خادمہ بولی، جو میرا، تیرا اور تیرے باپ کا رب ہے۔

فرعون کی بیٹی بولی، کیا میرا باپ سارے لوگوں کا رب نہیں ہے۔

خادمہ نے جواب دیا، جی نہیں ہم سب کا رب وہ ہے جو مجھے، تجھے، تیرے باپ اور سب لوگوں کو روزی دیتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تو میرے باپ کے علاوہ کسی اور کو اپنا رب سمجھتی ہے؟

جی ہاں: میرا، تیرا اور تیرے باپ کا رب اللہ ہی ہے۔

یہ سن کر فرعون کی لڑکی سیخ پا ہو گئی اور اپنے باپ کو اطلاع کر دی۔

فرعون جو پہلے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں زچ ہو کر جلا بھنا بیٹھا تھا۔ جب اُسے اطلاع ملی کہ ایمان کی روشنی اس کے محل میں داخل ہو گئی ہے۔ تو وہ آگ بگولہ ہو گیا کہ میرا کھانے والے ایمان کی دعوت قبول کر رہے ہیں۔ اُس نے فوراً خادمہ کو دربار میں طلب کر لیا۔

تو میرے سوا کسی اور کو اپنا رب مانتی ہے، کیا یہ بات درست ہے؟ فرعون نے خادمہ سے پوچھا۔

جی ہاں: یہ بات درست ہے کہ میرا اور تیرا رب اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ جو بزرگ و برتر اور سارے جہاں کا رازق ہے۔ یہ سن کر فرعون آگ بگولہ ہو گیا، اُس نے اپنے سپاہیوں کو فوراً تانبے کی دیگ گرم کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ جب یہ آگ کی طرح تپ جائے تو مجھے اطلاع کرنا۔ فرعون نے خادمہ کو دھمکی دی کہ اگر تو نے میری خدائی کو تسلیم نہ کیا اور موسیٰ کے دین پر قائم رہی تو میں تیرے سامنے تیرے بچوں کو اس دیگ میں پھینکواؤں گا اور آخر میں تجھے بھی اس میں پھینکوا دوں گا۔

فرعون کی بات سن کر خادمہ نے بڑی استقامت کا مظاہرہ کیا اور نہایت اطمینان اور سکون سے جواب دیا کہ میرا تو اللہ پر یقین ہے کہ میرا اور تیرا وہی مالک ہے۔ اس کے بدلے میں تو اگر مجھے اور میرے بچوں کو مار ڈالے گا تو میں صبر کروں گی۔ جب دیگ آگ کی طرح دھنسنے لگی تو فرعون نے بچوں کو سامنے کھڑا کر دیا اور کہا کہ اب بھی وقت ہے اگر تو موسیٰ کے دین سے پھر جائے تو میں تجھے اور بچوں کو چھوڑ دوں گا۔ ماشطہ نامی اس عورت کے لئے دین کے بغیر رہنا مشکل تھا اور بچوں کے بغیر بھی۔ اُس نے اپنے ایمان کے لئے بچوں اور اپنے آپ کو قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور بولی کہ تو جلنا چاہتا ہے تو جلادے۔ اُس ذاتِ پاک کے لئے ہماری جانیں قربان ہیں۔ ہاں یہ احسان کر دینا کہ میری اور بچوں کی ہڈیوں کو ایک جگہ دفن کر دینا۔ فرعون بولا، ٹھیک ہے تو نے ایک عرصے سے ہماری خدمت کی ہے۔ اس لئے ہم تیری یہ درخواست منظور کرتے ہیں۔

فرعون نے ایک بچے کو دہکتی ہوئی دیگ میں پھینکوا دیا۔ اور پل بھر میں اس کی ہڈیاں نظر آنے لگیں۔ فرعون کا خیال تھا کہ وہ عورت میرے پاؤں پڑ کر زندگی کی بھیک مانگے گی۔ مگر اس کی استقامت دیکھ کر اُسے اور غصہ آگیا اور اس نے دوسرا بچہ بھی پھینکوا دیا۔ اسی طرح تیسرا اور پھر چوتھا بچہ بھی پھینکوا دیا۔ آخر میں چھوٹے بچے کی باری آئی۔

جو اس وقت ماں کی چھاتی سے چمٹا دودھ پی رہا تھا۔ فرعون کے سپاہیوں نے جب بچے کو ماں سے چھینا تو ماں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ قریب تھا کہ وہ دیوانی ہو جاتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے بچے کو قوت گویائی عطا فرمائی۔ اور وہ بولا:

امی جان! صبر کرو، اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربانی دینا افضل نیکی ہے۔ اس پر ماں کو صبر آگیا۔

فرعون نے عورت کو بلا کہا کہ اب تو تیری عقل آگئی ہوگی۔ وہ بولی ہاں میری عقل ٹھکانے پر ہی ہے اور میں اپنے اس موقف پر قائم ہوں کہ میرا اور

تیرا رب اللہ ہی ہے۔ فرعون یہ سن کر باؤلا سا ہو گیا اور اُس نے خادمہ اور بچے دونوں کو دیگ میں پھینکوا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُس مومنہ کی ایمان پر

استقامت کے صلے میں جنت میں یہ محل عنایت فرمایا ہے۔

عاشقِ رسول اللہ محمد ﷺ

رسول اللہ ﷺ کی نبوت سے ایک ہزار سال پہلے کا واقعہ ہے۔ ملک یمن میں تُبَّعِ خَمیری نامی بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ اپنی سلطنت کے دورے پر نکلا تو بارہ ہزار اراکین سلطنت، عالم اور حکیم، علماء، ایک لاکھ بیس ہزار سوار فوجی اور ایک لاکھ تیرہ ہزار پیادہ فوج کا جم غفیر بادشاہ کے ہمراہ تھا۔ وہ جہاں سے بھی گذرتا، بادشاہ کی رعایا اُسکی شان و شوکت دیکھنے کیلئے جمع ہو جاتی۔ بادشاہ تُبَّعِ خَمیری سفر کرتا ہوا جب مکہ معظمہ پہنچا تو اُسے حیرت ہوئی کہ یہاں کوئی بھی اُس کے استقبال یا شان و شوکت کو دیکھنے کیلئے گلیوں اور بازاروں میں نہیں آیا۔ تُبَّعِ خَمیری نے وزیر اعظم سے اِس کی وجہ پوچھی تو اُس نے بتایا کہ اِس شہر میں ایک گھر ہے جسے لوگ بیت اللہ یعنی اللہ کا گھر کہتے ہیں۔ بیت اللہ اور خادین بیت اللہ کی زیارت کیلئے باہر سے آنیوالے لوگ سجد تعظیم کرتے ہیں۔ بیت اللہ کے خادین یہاں زیارت کیلئے آنیوالے لوگوں کی خدمت اور طعام و رہائش کا بندوبست کرتے ہیں۔ مقامی اور باہر سے آنیوالے لوگوں کا ہجوم آپ کے لشکر سے کہیں زیادہ ہوتا ہے تو پھر وہ آپ کے لشکر کی جانب کیوں متوجہ ہونگے۔

وزیر اعظم کی بات سُن کر بادشاہ جلال میں آگیا اور قسم کھا کر بولا: میں اِس گھر کو کھدوادوں گا اور یہاں کے باشندوں کو قتل کروادوں گا۔ بادشاہ کے اِن کلمات کی ادائیگی کے بعد اُس کی طبیعت بگڑنا شروع ہو گئی۔ بادشاہ کے ناک، منہ اور آنکھوں سے خون بہنا شروع ہو گیا اور ایسا بدبودار مادہ بہنے لگا کہ پاس بیٹھے لوگوں کو گھن آنے لگی۔ بادشاہ کے طبیب نے علاج شروع کیا مگر آفاقہ نہیں ہوا۔ شام کے وقت بڑا شاہی عالم بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بادشاہ کے چہرے کو دیکھ کر بولا۔ یہ آسمانی مرض ہے، اسکا زمینی علاج ممکن نہیں۔ پھر وہ عالم بادشاہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہنے لگا: اے بادشاہ سلامت! آپ نے اگر کوئی بُری نیت یا ارادہ کیا ہے تو فوراً توبہ کریں، یہی اِس مرض کا علاج ہے۔

بادشاہ نے بیت اللہ اور اُسکے خادین کے بارے میں کئے ارادے کی دل میں توبہ کر لی۔ بادشاہ نے چونکہ سچی توبہ کی تھی اس لئے اُسے فوراً آفاقہ ہو گیا۔ ناک، منہ اور آنکھوں سے بہنے والا خون اور بدبودار مادے کا اخراج بند ہو گیا۔ بادشاہ تُبَّعِ خَمیری نے صحت یاب ہونے کی خوشی میں بیت اللہ پر ریشمی غلاف چڑھایا اور شہر کے ہر باشندے کو سات اشرفیاں اور سات ریشمی لباس دیئے۔

تُبَّعِ خَمیری مکہ معظمہ سے نکلا تو قافلے کیساتھ یثرب (مدینہ) پہنچا۔ بادشاہ کے ساتھ جو علماء تھے وہ آسمانی کتابوں کے علم پر بھی عبور رکھتے تھے۔ انہوں نے یثرب کی مٹی کو سونگھا اور پھر کنکریاں اٹھا کر بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بولے: بخدا! یہاں پائی جانوالی علامات یہ بتاتی ہیں کہ یہی آخری نبی محمد ﷺ کی ہجرت گاہ ہے، اب ہم یہیں رہ کر نبیِ آخر الزماں محمد ﷺ کی تشریف آوری کا انتظار کریں گے۔ قسمت میں ہوا تو ہمیں اُن کا دیدار نصیب ہو جائیگا ورنہ ہماری قبروں پر جو نبیِ آخر الزماں محمد ﷺ کی جوتیوں سے اڑنے والی خاک پڑے گی وہ ہماری آخرت میں نجات کا سبب بن جائیگی۔

اپنے علماء کی بات سن کر بادشاہ تُبَّعِ خَمیری نے اُن کیلئے چار سو مکانات تعمیر کروائے اور بڑے عالم کی رہائش گاہ کے پاس رسول اللہ ﷺ کیلئے نہایت عمدہ دو منزلہ مکان تعمیر کروایا اور وصیت کی کہ جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائیں تو یہ اُنکی رہائش گاہ بنے۔ تُبَّعِ خَمیری نے اپنے چار سو علماء کو کافی مالی امداد بھی دی اور یہیں پر مقیم رہنے کی تلقین کی۔ پھر رسول اللہ ﷺ کیلئے ایک خط لکھا اور بڑے عالم کے سپرد کرتے ہوئے کہا: اگر تمہیں رسول اللہ ﷺ کی زیارت نصیب ہو تو میرا یہ خط اُنکی خدمت میں پیش کر دینا۔ ورنہ اپنی اولاد کو نصیحت کر جانا کہ یہ خط نسل در نسل آگے منتقل کرتے جانا، حتیٰ کہ یہ خط رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں پیش کر دیا جائے، یہ نصیحت کرتے ہوئے بادشاہ تُبَّعِ خَمیری وہاں سے رخصت ہو گیا۔

شاہِ یمن تُبَّعِ خَمیری کا یہ خط بڑے عالم کی اولاد میں نسل در نسل منتقل ہوتا رہا، اور آخر کار بڑے عالم کی اولاد میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پہنچ گیا۔ انہوں نے یہ خط اپنے خاص غلام ابولیلیٰ کی تحویل میں دیدیا۔ اُس وقت مدینہ میں انہی علماء کی نسلوں کی اکثریت آباد تھی۔ اور یہ لوگ نسل در نسل رسول اللہ ﷺ کی آمد کے مُستظر رہے تھے اور جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو ان لوگوں کی بڑی تعداد اسلام قبول کر چکی تھی۔

آپ ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ اُنکے ہاں قیام کریں۔ رسول اللہ ﷺ کسی بھی شخص کو مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے، اس لئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری اونٹنی کی رسی چھوڑ دو، یہ خود ہی میری قیام گاہ تک پہنچ جائیگی۔ چنانچہ اونٹنی کو کھلا چھوڑ دیا گیا اور وہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کے قریب بیٹھ گئی۔

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھاگتے ہوئے آئے اور کہنے لگے: یا رسول اللہ ﷺ! سب سے قریب تو میرا گھر ہے اور آپ کی مہمانداری تو ازل سے میری قسمت میں لکھی تھی۔ پھر وہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے گھر لے گئے۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ ﷺ کو اوپر کی منزل میں رہنے کی پیشکش کی مگر آپ ﷺ نے نیچے کی منزل کو پسند فرمایا۔

جب آپ ﷺ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر میں قیام پذیر ہو گئے تو لوگوں نے ابولیلیٰ کو بھیجا کہ وہ شاہِ یمن تُبَّعِ خَمیری کا خط رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کرے۔ یہ لوگ چونکہ شاہِ یمن تُبَّعِ خَمیری کے علماء کی نسلوں سے تھے، اس لئے خط کے متعلق جانتے تھے۔ جب ابولیلیٰ رسول اللہ ﷺ کے سامنے پہنچا تو آپ ﷺ نے دیکھتے ہی فرمایا: تم ابولیلیٰ ہو؟

رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے اپنا نام سن کر ابولیلیٰ بڑا متعجب ہوا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ابولیلیٰ! لاؤ شاہِ یمن کا خط مجھے دیدو۔ ابولیلیٰ نے وہ خط رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے وہ خط پڑھا:

کمترین مخلوق تُسَبِّحُ اُولِ خَمِیرِی کی طرف سے

شَفِیعُ الزَّہْنِ سَیِّدُ الْمَرْسَلِینِ مُحَمَّدٌ ﷺ اَمَّا بَعْدُ:

اے اللہ کے حبیب! میں آپ پر ایمان لاتا ہوں اور جو کتاب آپ پر نازل ہوگی اُس پر بھی ایمان لاتا ہوں اور میں آپ کے دین پر ہوں، پس اگر مجھے آپ کی زیارت کا موقع مل گیا تو بہت اچھا اور غنیمت، اور اگر میں آپ کی زیارت نہ کر سکا تو میری شفاعت فرمانا اور قیامت کے روز مجھے فراموش نہ کرنا، میں آپ کی پہلی اُمت میں سے ہوں اور آپ کے ہاتھ آپ کی آمد سے پہلے ہی بیعت کرتا ہوں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اور آپ اُس کے سچے رُسل ہیں۔

رُسل اللہ ﷺ نے خط پڑھ کر فرمایا: صالح بھائی تُسَبِّحُ خَمِیرِی کو آفرین و شاباش ہے۔

یہ تحریر ابنِ عساکر، کتابُ الْمُسْتَظَرَفِ، حُجَّةُ اللہ علی الْعَالَمِینِ اور میزِ الْاَلَدِیَانِ سے لی گئی ہے۔

اُم المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ایثار

نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے۔ ایک روز محمد ﷺ صبح کے وقت مکہ کی بستی سے باہر نکلے تو آپ ﷺ کو بستی سے باہر کچھ خیمے نظر آئے۔ آپ ﷺ اُن کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ خیموں میں مقیم لوگ دُبلے پتلے اور بھوک کی وجہ سے کمزور اور لاغر نظر آرہے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ وہ لوگ اچھی اُمید لئے یہاں آئے تھے۔ محمد ﷺ اُن کی حالت دیکھ کر بڑے غمزدہ ہوئے، آپ کے پاس دینے کیلئے کچھ بھی نہ تھا۔ آپ ﷺ اُفسردہ دلی سے گھر لوٹ آئے اور چادر اوڑھ کر بستر پر لیٹ گئے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دیکھا کہ آپ ﷺ باہر سے تشریف لاتے ہی بستر پر چادر اوڑھ کر لیٹ گئے ہیں۔ شریکِ حیات ہونے کے ناطے سے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جانتی تھیں کہ آپ ﷺ عموماً اُفسردگی کی حالت میں ہی ایسا کرتے تھے۔ وہ آپ کے پاس آئیں اور احوال پوچھنے لگیں۔ محمد ﷺ نے باہر پیش آنیوالے احوال بیان فرمادیئے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہنے لگیں: محمد ﷺ! آپ میرے شریکِ حیات ہیں، اس ناطے سے میرا تمام مال و اسباب آپ ہی کا ہے۔ آپ جتنا جی چاہے، اُن میں تقسیم فرما دیجئے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بات سن کر آپ ﷺ خاموش رہے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ ﷺ سے کہا کہ آپ جائیں اور مکہ کی بستی کے تمام معززین کو بلا لائیں۔ آپ ﷺ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بات سن کر اُٹھے اور مکہ کے معززین کو بلا لائے۔

جب محمد ﷺ معززین مکہ کو بلانے گئے ہوئے تھے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنی تمام دولت لا کر صحن میں ڈھیر کر دی۔ جب معززین مکہ آکر بیٹھ گئے تو آپ ﷺ بھی زمین پر بیٹھ گئے۔ اتفاق سے جب آپ ﷺ زمین پر بیٹھے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سامنے تھے مگر درمیان میں دولت کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ دولت کا یہ ڈھیر اتنا اونچا تھا کہ آپ ﷺ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو نظر نہیں آرہے تھے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے معززین مکہ سے فرمایا: میں نے آپ سب لوگوں کو اس لئے بلایا ہے تاکہ آپ گواہ رہیں کہ میں نے اپنی یہ تمام دولت محمد ﷺ کو دیدی ہے۔ اُن کو مکمل اختیار ہے کہ وہ اسے جیسے چاہیں استعمال کریں۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا رسول اللہ ﷺ کی پہلی بیوی تھیں۔ جب تک حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حیات رہیں آپ ﷺ نے اور شادی نہیں فرمائی۔ آپ ﷺ کی چاروں بیٹیاں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا میں سے تھیں جو حیات رہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی شریکِ حیات حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اوصاف اس پیار سے بیان فرماتے تھے کہ مجھے رشک ہونے لگتا تھا کہ کاش میں اُنکی جگہ ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ کو سب سے زیادہ دولت دینے والوں میں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

تعالیٰ عنہا سب سے آگے تھیں۔ آپ کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام آتا ہے اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ آتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے جب نبوت کا اعلان فرمایا تو سب سے پہلے ایمان لانے کا شرف بھی حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو حاصل ہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اُمہات المؤمنین میں سب سے زیادہ مالد ار خاتون تھیں مگر انہوں نے اپنا سب کچھ رسول اللہ ﷺ اور اسلام پر قربان کر دیا۔ انہوں نے اپنی تمام زندگی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک صابر و شاکر خاتون اور نیک دل بیوی کی حیثیت سے گزاری۔ رسول اللہ ﷺ سے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تیسری شادی تھی۔ شادی سے قبل انہوں نے مکہ کے معزز اور امیر گھرانوں سے آنیوالے رشتے ٹھکرائے مگر رسول اللہ ﷺ کی شرافت اور دیانتداری سے متاثر ہو کر خود شادی کا پیغام بھجوایا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو تمام عالم میں خاتونِ اول کا مرتبہ عطا فرمایا۔

غلام صحابی رسول اللہ ﷺ اور شہید

محمد رسول اللہ ﷺ نے اعلانِ نبوت فرمادیا تھا۔ مدینہ میں شدت کی گرمی پڑ رہی تھی اور بازار میں کھڑا ایک تاجر پسینے میں شرابور اپنا مال فروخت کر رہا تھا۔ جب سب مال فروخت ہو چکا تو ایک غلام بچہ باقی بچا اور وہ بھی تاجر کیساتھ پسینے میں بھگا ہوا کھڑا تھا۔ کوئی بھی اس بچے میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ تاجر سوچ رہا تھا کہ میرا مال تو اچھے داموں بک گیا ہے، اب اگر یہ غلام بھی بک جائے تو میں جلدی سے اپنے گھر کی راہ لوں۔ مگر جب کافی دیر تک کسی نے غلام کے بارے میں نہیں پوچھا تو تاجر نے سوچا کہ اگر کسی نے اسے خریدنے میں دلچسپی ظاہر کی تو میں اسے قیمتِ خرید میں ہی فروخت کر کے جان چھڑاؤں گا۔

زیادہ دیر نہیں گزری کہ تاجر کو ایک لڑکی مدینہ کے بازار میں چلتی ہوئی نظر آئی۔ اُس لڑکی رُخ تاجر کی جانب ہی تھا۔ وہ لڑکی تاجر کے پاس آکر رُک گئی اور غلام بچے پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ اس بچے کو کتنے میں فروخت کرو گے؟ گاہک لڑکی کی بات سُن کر تاجر بیحد خوش ہوا اور بولا کہ یہ بچہ میں تمہیں قیمتِ خرید پر ہی دیدوں گا۔ لڑکی نے پوچھ کر دام ادا کئے اور بچے کو ساتھ لیکر چلی گئی اور تاجر بھی خوشی خوشی گھر روانہ ہو گیا۔

ابو حذیفہ کسی کام کی غرض سے مکہ سے مدینہ آئے تو انہیں بھی یہ قصہ معلوم ہوا تو انہوں نے کھوج لگا کر لڑکی کا گھر معلوم کیا اور نکاح کا پیغام بھجوایا۔ لڑکی کے گھر والوں نے مناسب سمجھ کر ہاں کر دی اور یوں شہیتہ بنت یعار نامی لڑکی کا نکاح ابو حذیفہ سے ہو گیا۔ لڑکی غلام بچے کو بھی اپنے ساتھ لے آئی۔ کچھ دنوں بعد جب ابو حذیفہ مکہ واپس لوٹے تو انکی بیوی شہیتہ بنت یعار اور غلام بچہ بھی ہمراہ تھے۔

ابو حذیفہ مکہ پہنچے تو کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اپنے بچپن کے دوست عثمان بن عفان سے ملنے اُن کے گھر پہنچے تو انہیں محسوس ہوا کہ آج عثمان بن عفان میں پہلے جیسی گر محوشی نہیں ہے۔ پوچھا: عثمان! یہ بے رُخی کیسی؟

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بولے: حذیفہ! ناراضگی کی کوئی بات نہیں ہے، لیکن میرے اور تمہارے راستے الگ ہو گئے ہیں۔

حذیفہ بولے: عثمان! یہ راستے الگ کیوں ہو گئے؟ کیا میں نے کچھ غلط کر دیا؟

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بولے: حذیفہ! میں نے محمد ﷺ کے ہاتھوں اسلام قبول کر لیا ہے، اس لئے جب ہمارا دین جُدا جُدا تو پھر راستے ایک کیسے ہو سکتے ہیں؟

حذیفہ بولے: عثمان! مجھے محمد ﷺ کے پاس لے چلو تاکہ میں اسلام قبول کر کے تمہارے ساتھ ایک راستے پر چل سکوں۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حذیفہ کو ساتھ لیا اور محمد رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچ گئے اور آنے کا مقصد بیان کیا۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حذیفہ بولو!

"أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ"

حذیفہ نے کلمہ شہادت پڑھا اور مسلمان ہو گئے۔ حذیفہ گھر واپس لوٹے تو سارا واقعہ اپنی بیوی ثبیتہ بنت یعار کو سنایا۔ انہوں نے سُن کر کہا: حذیفہ! میں اپنی راہیں تم سے جدا نہیں کر سکتی اس لئے مجھے بھی مسلمان کر لو۔ ثبیتہ بنت یعار کو اسلام قبول کرتے ہوئے دیکھ کر غلام بچہ بولا: میرا سب کچھ تو آپ دونوں ہیں، اس لئے میں بھی اسلام قبول کرتا ہوں۔ یوں بچے نے بھی اسلام قبول کر لیا۔

بچے کے قبولِ اسلام کے بعد حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بولے: اب ہم تینوں اسلام لا چکے اور اسلام میں کوئی آقا یا غلام نہیں اس لئے اب تم آزاد ہو۔

بچہ کہنے لگا: میرا تو آپ دونوں کے سوا کوئی نہیں، اگر آپ نے مجھے آزاد کر دیا تو میں کہاں جاؤں گا؟

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ بولے: لڑکے! میں نے تمہیں آزاد کیا اور اب تم اس گھر میں ہمارے ساتھ بیٹے بن کر رہو گے؟

بچہ خوش ہو گیا۔ اُس نے جلد ہی قرآن پڑھنا سیکھ لیا اور تھوڑے ہی دنوں میں بہت سافُر آن یاد بھی کر لیا۔ بچہ نہایت مسحور کن آواز میں قرآن کی تلاوت کرتا تھا۔ جب ہجرت کا حکم آ گیا اور رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کی اجازت فرما دی تو ابتدائی ہجرت کر نیوالے قافلوں میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خاندان کے ساتھ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اُنکی بیوی اور بچہ بھی ساتھ تھے۔

جب کافی لوگ ہجرت کر کے مدینہ آ گئے تو نماز باجماعت کیلئے امام چننے کا مرحلہ آیا تو حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مُنہ بولے بیٹے کو سب سے زیادہ قرآن حفظ تھا اور آواز بھی نہایت خوبصورت تھی۔ چنانچہ امامت اسے دیدی گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اسی کی امامت میں نماز ادا کرتے تھے۔

مدینہ کے یہودی جانتے تھے کہ یہ وہی غلام لڑکا ہے جسے کوئی خریدنے کیلئے تیار نہ تھا۔ آج اللہ نے اسے کتنی عزت دی ہے کہ مسلمانوں کا امام بن گیا ہے۔ روایت ہے کہ جب یہ لڑکا تلاوتِ قرآن کر رہا ہو تا تھا تو راہ چلنے والے بھی رُک کر سننے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

محمد رسول اللہ ﷺ بھی ہجرت کر کے مدینہ آ چکے تھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ ﷺ سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو کر آپ ﷺ کے ساتھ حُجرے میں مقیم تھیں۔ ایک روز آپ ﷺ گھر میں تشریف فرما تھے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو آپ کی خدمت پیش ہونے میں تھوڑی دیر ہو گئی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: عائشہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا)! اتنی دیر سے کہاں تھی؟

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بولیں: اللہ کے رسول ﷺ! آج ایک قاری تلاوتِ قرآنِ پاک کر رہا تھا، اُس کی آواز اتنی مسحور کن تھی کہ میں رُک کر سننے پر مجبور ہو گئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بات سُن کر رسول اللہ ﷺ کو بھی اشتیاق ہوا اور آپ ﷺ چادر اوڑھ کر باہر آ گئے۔ آپ ﷺ نے دیکھا کہ ایک لڑکا بیٹھا تلاوت کر رہا ہے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: لڑکے! تم کون ہو؟

لڑکا بولا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میرا نام سالم ہے اور میں حذیفہ کا منہ بولا بیٹا ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے خوش ہو کر فرمایا: اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے تمہارے جیسے شخص کو میرا امتی بنایا۔

تاریخ میں انہیں حضرت سالم مولیٰ حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ حضرت سالم مولیٰ حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جنگِ موتہ میں جامِ شہادت نوش کیا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی رسول اللہ ﷺ کے بہترین امتی بنائے۔ آمین، یا رب العالمین۔

ایک مجوسی کا صاحبِ ایمان ہونا

ایک دفعہ مدینہ میں قحط پڑ گیا تو لوگ دوسرے علاقوں کی طرف ہجرت کر گئے۔ ہجرت کرنیوالوں میں ایک خاندان آلِ رسول ﷺ میں سے بھی تھا۔ یہ ایک بیوہ خاتون تھیں جو مدینہ میں اپنی سات کنواری جوان بیٹیوں کیساتھ رہتی تھیں۔ جب مدینہ میں قحط پڑا تو یہ خاندان بھی اس کی زد میں آ گیا۔ مدینہ کے منافقین مذاق اڑانے لگے کہ لوگو دیکھو! رسول اللہ ﷺ کا خاندان بھی آج بھوک اور بے بسی کی حالت میں ہے۔ منافقین کی باتوں سے عاجز آ کر وہ بیوہ خاتون بھی ہجرت کر کے شام میں چلی گئیں۔ طویل سفر کے بعد جب وہ شام کے ایک قصبے میں پہنچیں شام ڈھل چکی تھی وہ تھکاوٹ اور بھوک و پیاس سے بے بس ہو کر بچیوں کے ساتھ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئیں۔

لوگوں نے دیکھا کہ ایک خاتون اپنی بچیوں کیساتھ بے سروسامان درخت کے نیچے بیٹھی ہے جو مسافر معلوم ہوتی ہے اور لباس سے مسلمان لگتی ہے۔ ایک شخص اُن کے پاس آیا اور حالات معلوم کئے۔ خاتون نے بتایا کہ وہ مسلمان ہے اور مدینہ میں خوراک و اناج کی قلت سے مجبور ہو کر وہ شام چلی آئی ہے، مگر یہاں تو کوئی اُس کا جاننے والا نہیں ہے۔ وہ شخص بولا: یہ سامنے والا گھر ایک مسلمان کا ہے، آپ اُن سے پناہ لے لیں۔

وہ خاتون اُٹھیں اور جا کر دروازے پر دستک دی۔ ایک ادھیڑ عمر شخص باہر نکلا اور دستک کا سبب معلوم کیا۔ خاتون بولیں: مدینہ میں قحط کے سبب میں مجبوراً ہجرت کر کے یہاں آئی ہوں۔ میرا تعلق آلِ رسول ﷺ سے ہے۔ رات ہونے کو ہے اور میں یہاں جوان بچیوں کیساتھ بیٹھی ہوں، میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ کسی نے بتایا تھا کہ آپ مسلمان ہیں تو میں نے پناہ کیلئے دستک دیدی۔ میں یہاں جوان بچیوں کیساتھ بے سروسامان بیٹھی ہوں اور رات بھی سر پر ہے، مہربانی فرما کر آپ مجھے پناہ دیدیجئے۔

وہ شخص بولا: میں یہ کیسے مان لوں کہ تم واقعی آلِ رسول ﷺ میں سے ہو؟ اس بات کی کوئی دلیل ہے تمہارے پاس؟

خاتون بولی: بھائی! میں بڑی عجلت میں گھر سے نکلی تھی، اُس وقت تو بھوک سے جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں کہ جو دکھا کر تمہیں یقین دلا سکوں، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کوئی سبب پیدا فرمادے۔

وہ شخص بولا: خاتون! ایسے تو نہ جانے کتنے لوگ آتے ہیں اور دلیلیں دیتے ہیں۔ یہ کہہ کر اُس نے دروازہ بند کر لیا اور بیچاری خاتون واپس درخت کے نیچے جا بیٹھی۔

ایک شخص جو یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ آکر بولا: محترم خاتون! آپ فلاں گھر پر جائیں، وہاں ایک مجوسی رہتا ہے جو بڑا سخی اور ہمدرد شخص ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کو ضرور پناہ دیدیگا۔

خاتون بے بسی کے عالم میں اُٹھی اور بچیوں کو ساتھ لیکر مجوسی کے دروازے پر جا پہنچی۔ دستک دی تو مجوسی نے دروازہ کھولا۔ دروازے پر ایک معزز

خاتون بچیوں کے ہمراہ کھڑی تھی۔ وہ شخص بولا: معزز خاتون! میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ عورت نے وہی الفاظ دہرائے، جو اُس نے مسلمان سے کہے تھے۔

خاتون کی بات سُن کر مجوسی کا رنگ فق ہو گیا، اُس نے جلدی سے دروازہ کھولتے ہوئے کہا: آپ اندر تشریف لے آئیں۔ خاتون اور اُس کی بیٹیوں کو بڑے احترام سے بٹھایا اور اپنی بیوی سے بولا: دیکھو کتنے عظیم لوگ آج ہمارے گھر میں آئے ہیں۔ یہ اللہ کے رُسل محمد ﷺ کے خاندان میں سے ہیں، تم ان کے کھانے کا بندوبست کرو میں بازار سے کچھ سودا سلف لے آؤں۔ یہ کہتے ہوئے اُس شخص کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خاتون نے بچیوں کیساتھ مل کر کھانا کھایا اور سو کر بڑی پرسکون رات گذاری۔

دوسرے روز مجوسی کے دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ اُس نے دروازہ کھولا تو باہر اُس کا پڑوسی مسلمان کھڑا تھا۔ مجوسی کو دیکھتے ہی وہ شخص بولا: کل جو خاندان تیرے پاس آیا ہے، اُسے میرے حوالے کر دو۔

مجوسی بولا: وہ تو اب میری پناہ میں ہیں، میں انہیں کیسے تیرے حوالے کر سکتا ہوں؟

مسلمان بولا: تو مجوسی ہے اور وہ مسلمان ہیں اور پھر آلِ رُسل ﷺ ہیں، تو انہیں نہیں رکھ سکتا۔

مجوسی بولا: کل تو تو نے انہیں دھتکار دیا تھا، ایسی کیا بات ہو گئی کہ اب تو انہیں واپس لینے پہنچ گیا۔

وہ شخص بولا: میں اس خاندان کو واپس کر کے جو رات سویا ہوں تو رُسل اللہ ﷺ کی خواب میں زیارت ہوئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ جو سامنے ہیرے، موتیوں اور جواہرات سے بنا محل کھڑا ہے، یہ ایک صاحبِ ایمان شخص کا ہے۔

میں نے کہا: اللہ کے رُسل ﷺ! میں بھی تو صاحبِ ایمان ہوں۔

رُسل اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہارے پاس صاحبِ ایمان ہونے کی کوئی دلیل ہے؟

میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور سمجھ گیا کہ رُسل اللہ ﷺ نے مجھ سے صاحبِ ایمان ہونے کی دلیل کیوں مانگی ہے؟

مسلمان کی بات سُن کر مجوسی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، پھر وہ اچانک زور زور سے ہنسنے لگا۔

مسلمان کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا اور بولا، تجھے کس بات پہ ہنسی آئی ہے؟

مجوسی بولا: میں اس لئے ہنسا کہ تو نے وہ خواب پورا نہیں دیکھا۔ رُسل اللہ ﷺ کے پہلو میں میں بھی کھڑا تھا اور وہ محل میرا تھا۔ اُس عظیم خاندان کی

بدولت اللہ تعالیٰ نے مجھے اور میرے پورے خاندان کو ایمان کی دولت سے نوازا۔ اب جاؤ تم نے بہت دیر کر دی، ارے نادان! تو تو اللہ سے بھی سودا

دیکھ کر کرتا ہے۔ میں ہی وہ صاحبِ ایمان شخص ہوں اور وہ محل بھی میرا ہی تھا۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سخاوت

قبیلہ بنو سلیم کا ایک ضعیف آدمی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر پڑھو! "أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ"

قبیلہ بنو سلیم کے اُس شخص نے کلمہ شہادت پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔ آپ ﷺ نے اُس شخص کو دین اسلام کے احکام اور مسائل بتائے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہارے پاس کچھ مال و دولت ہے؟

وہ شخص بولا: اللہ کے رسول ﷺ! میں قبیلہ بنو سلیم کا سب سے غریب شخص ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: تم میں سے کون اس غریب شخص کی مدد کریگا؟

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی جگہ سے اُٹھے اور عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میرے پاس ایک اونٹنی ہے۔ میں وہ اس شخص کو دیتا ہوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا: ”تم میں سے کون ہے جو اب اس کا سر ڈھانک دے؟“

سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اُٹھے اور اپنا عمامہ اتار کر اُس شخص کے سر پر رکھ دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کون ہے جو اس شخص کیلئے کھانے کا بندوبست کرے؟

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اُٹھے اور اُس شخص کو ساتھ لیکر کھانے کا بندوبست کرنے نکل پڑے۔ چند گھروں کے دروازے کھٹکھٹائے مگر کچھ نہ مل سکا۔ اب جس دروازے پر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دستک دی وہ رسول اللہ ﷺ کی بیٹی حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا تھا۔

حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پوچھا: کون ہے؟

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا نام بتایا اور پورا واقعہ سناتے ہوئے التجا کی: اے رسول اللہ ﷺ کی بیٹی! اس مسکین کی خوراک کا کچھ بندوبست کر دیجیئے۔

حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی آنکھیں نم ہو گئیں اور بولیں: اے سلمان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)! خدا کی قسم میرے گھر میں تو تین روز سے فاقہ ہے اور دونوں بچے حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی بھوکے پیٹ سوئے ہوئے ہیں۔ لیکن فکر کی کوئی بات نہیں کیونکہ کوئی سائل بنت رسول اللہ ﷺ کے دروازے پر آکر خالی نہیں جاسکتا۔

اے سلمان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)! تم میری یہ چادر شمعون یہودی کے پاس لے جاؤ اور کہو کہ فاطمہ بنت محمد ﷺ کی یہ چادر رکھ لو اور بدلے میں اس غریب شخص کو تھوڑا سا کھانے کا سامان دیدو۔

جب حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شمعون یہودی سے جا کر یہی بات کہی تو وہ پکار اُٹھا:

اے سلمان! خدا کی قسم! یہ تو وہی لوگ ہیں، جن کا ذکر ہماری کتاب توریت میں کیا گیا ہے۔

اے سلمان: تم گواہ رہنا! میں آج فاطمہ رضی اللہ عنہا کے باپ محمد ﷺ پر ایمان لایا۔

شمعون نے اسلام قبول کر کے کچھ غلہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیا اور سیدہ حضرت فاطمہ الزہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی چادر بھی واپس کر دی۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ غلہ لیکر حضرت فاطمہ الزہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس پہنچے تو انہوں نے جلدی سے غلہ پیسا اور روٹیاں بنا کر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیں کہ جلدی سے یہ اُس مسکین شخص کو دیدو۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ آپ اس میں سے کچھ کھانا بچوں کیلئے رکھ لیں۔

سیدہ حضرت فاطمہ الزہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا: اے سلمان! (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) جو چیز میں اللہ کی راہ میں دے چکی ہوں وہ میرے بچوں کیلئے جائز نہیں ہے۔

حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھانا لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کھانا دیتے ہوئے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ آپ ﷺ نے وہ کھانا قبیلہ بنو سلیم کے مسکین شخص کو دیدیا۔

رسول اللہ ﷺ حضرت فاطمہ الزہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر تشریف لے گئے اور اپنا دستِ شفقت اُن کے سر پر پھیرتے ہوئے دُعا کی: یا اللہ! فاطمہ تیری کنیز ہے تو اس سے راضی رہنا۔

خلیفۃ المسلمین حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ واقعہ فیل کے تین سال بعد پیدا ہوئے۔ آپ کا نسب ساتویں پشت میں رسول اللہ ﷺ سے جاملتا ہے۔ آپ کا تعلق قبیلہ قریش کے خاندان بنو تمیم سے ہے۔ آپ رسول اللہ ﷺ سے عمر میں تقریباً دو سال دس ماہ چھوٹے ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی پیدائش واقعہ فیل کے پچاس دن بعد ہوئی۔ آپ کا نام عبد الکعبہ رکھا گیا، جسے رسول اللہ ﷺ نے بدل کر عبد اللہ رکھا اور آپ کی کنیت ابو بکر تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو صدیق کہا، اس طرح تاریخ اسلام میں آپ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام سے پہچانے اور پکارے جاتے ہیں۔ آپ کے والد کا نام عثمان بن ابی قحافہ اور والدہ کا نام ام الخیر سلمیٰ تھا۔ آپ کے خاندان کا پیشہ تجارت اور کاروبار تھا۔ آپ بچپن ہی سے رسول اللہ ﷺ کے ہم پیالہ و ہم نوالہ تھے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ طائف کے سفر کے علاوہ بچپن سے وفات تک ہر وقت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ فضیلت بھی حاصل ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تمام خاندان ماں باپ اور اولادیں اسلام لائیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسول اللہ ﷺ کا ساتھی قرار دیا اور انہیں آپ سے تمام معاملات میں مشاورت کا حکم دیا۔ ہجرت کے سفر میں رسول اللہ ﷺ نے آپ کو اپنا ساتھی بنایا اور دشمن کے پیچھا کرنے کے ڈر سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ ﷺ کو کندھوں پر اٹھا کر میلوں چلتے رہے۔ جب رسول اللہ ﷺ معراج سے واپس لوٹے اور اہل مکہ کو سفر کے بارے میں بتایا تو مشرکین مکہ نے مذاق اڑایا۔ وہ اکٹھے ہو کر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آئے اور کہنے لگے:

اے ابن ابی قحافہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)! اپنے دوست کے بارے میں کچھ سنا آپ نے؟

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا: کیوں کیا ہوا؟

ایک سردار نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا: تمہارے دوست محمد (ﷺ) ابن عبد اللہ کہتے ہیں کہ وہ رات کو بیت المقدس اور سات آسمانوں پر سے ہو کر آئے ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کیا واقعی یہ محمد (ﷺ) ابن عبد اللہ نے فرمایا ہے؟

مشرکین مکہ طنزیہ انداز میں بولے: ہاں ہاں! یہ سب قصہ انہوں نے ہی ہمیں سنایا ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بولے: اگر واقعی انہوں نے یہ سب کہا ہے تو مجھے انکی سچائی میں کوئی شک نہیں، کیونکہ ان کی زبان مبارک پر سچ بات کے علاوہ کوئی بات نہیں آتی۔

مشرکین مکہ حیرت سے بولے: اے ابنِ ابی قحافہ! کیا تم اس بات کی تصدیق کرتے ہو کہ محمد (ﷺ) ابنِ عبد اللہ رات کے پچھلے پہر میں بیت المقدس اور سات آسمانوں پر گئے اور پھر صُبح ہونے سے پہلے واپس بھی آگئے؟

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ہاں میں اُن کی ہر بات کی تصدیق کرتا ہوں۔

ابو جہل اور ساتھیوں سے فارغ ہو کر آپ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ بیان کرتے ہوئے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا واقعی آپ نے ایسا فرمایا ہے؟

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہاں ابو بکر! میں نے ایسا ہی کہا ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بولے: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں آپ کی بات کی تصدیق کرتا ہوں کیونکہ آپ بالکل سچے ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت پر اللہ تعالیٰ نے انہیں "صدیق" کا خطاب دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے دُنیا میں ہر کسی کے احسان کا بدلہ چکا دیا ماسوائے ابو بکر کے۔ اُن کے احسانوں کا بدلہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز خود ادا کریں گے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مردوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہے۔ آپ ﷺ نے جہاد کیلئے مالی امداد کی درخواست کی تو آپ اپنے گھر کا تمام سامان لیکر حاضر ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: اے ابو بکر! کچھ گھر میں بھی چھوڑ کر آئے ہو؟

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بولے: اللہ کی نبی ﷺ! میں گھر میں آپ کی محبت چھوڑ کر آیا ہوں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابو بکر! تم کو اللہ تعالیٰ نے آتشِ جہنم سے آزاد کر دیا ہے۔ اور آپ کو "عتیق" کا لقب عطا فرمایا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ اُنکی کنواری بیٹی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں آئیں جو رسول اللہ ﷺ کی سب سے چہیتی بیوی تھیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ابو بکر وہ واحد شخص ہیں، جنہوں نے میری ایک آواز پر لبیک کہتے ہوئے اسلام قبول کیا۔

ایک موقع پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روتے ہوئے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں اور میرا سب مال آپ ہی کا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ابو بکر کے مال سے بڑھ کر کسی مال نے مجھے نفع نہیں پہنچایا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: میری اُمت پر سب سے بڑھ کر مہربان ابو بکر ہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ابو بکر میرے یارِ غار ہیں اور وہ روزِ قیامت حوضِ کوثر پر میرے ساتھ ہوں گے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: کسی قوم کیلئے ابو بکر بہتر کوئی امام نہیں۔ آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرما کر اپنے وصال کے بعد ابو بکر کو خلیفہ بنانے کا اشارہ دے دیا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت بلال بن رباح رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اُم عیسٰی، ابو کلہبہ، نہدیہ اُن بیٹی، زہیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سمیت بہت سے غلاموں کو آزاد کروایا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تبلیغ سے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سمیت بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی کہ کیا آپ نے اپنی علالت کے ایام میں حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امام بنایا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، نہیں! میں نے نہیں بنایا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے بنایا تھا (یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے انہیں امام بنایا تھا)۔ (تاریخ الخلفاء: ۱۲۶، ابن عساکر)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ سعادت بھی حاصل ہے کہ انہوں نے مسجد نبوی ﷺ کی زمین کی قیمت ادا کر کے صدقہ جاریہ کا ثواب پایا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا روزِ قیامت کوئی ایسا شخص بھی ہو گا کہ اُس جنت کے تمام دروازوں سے پکارا جائے گا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہاں ابو بکر! مجھے اُمید ہے کہ تم انہی لوگوں میں ہو گے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اُنکی چار نسلوں کو صحابی رسول اللہ ﷺ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے زندگی بھر کسی کو آپ پر فضیلت نہیں دی۔

جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ بنے تو صبح کپڑا کندھے پر ڈالے فروخت کرنے جا رہے تھے۔ راستے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مل گئے، انہوں نے پوچھا: ابو بکر! کہاں جا رہے ہو؟

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بولے: کپڑا فروخت کرنے جا رہا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بولے: ابو بکر! اب آپ خلیفہ ہیں اور اُمت کو آپ کی زیادہ ضرورت ہے۔ آپ گھر کے اخراجات کیلئے بیت المال سے وظیفہ لیں۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نے مزدور کی کم سے کم اجرت لینا قبول کیا۔ ایک روز آپ کی زوجہ محترمہ نے کھانے میں میٹھا رکھا تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت خوش ہوئے اور پوچھا کہ یہ میٹھا کہاں سے آیا؟ آپ کی زوجہ محترمہ نے بتایا کہ میں جانتی ہوں کہ آپ کو میٹھا پسند ہے، اس لئے میں نے روزانہ چٹکی چٹکی جمع کر کے یہ بنایا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا جب کم میں گزارہ ہو سکتا ہے تو میں وظیفے میں تھوڑی سی کمی کر دیتا ہوں۔

جب آپ بیماریِ مرگ میں مبتلا ہوئے تو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا: میری زمین بیچ کر میرے دورِ خلافت کے وظیفے کا حساب لگا کر بیت المال میں جمع کروادینا۔ میرے حبشی غلام، میری اونٹنی اور میرا مال خلیفہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہنچا دینا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھیجا ہوا مال و اسباب دیکھ کر فرمایا: اللہ ابو بکر صدیق پر رحم فرمائے۔ انہوں نے اپنے بعد آئیوالوں کو بڑی مشکل میں ڈال دیا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: عائشہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)! میری وفات پر میرے پہنے ہوئے کپڑے دھو کر مجھے کفن پہنا دینا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بولیں: بابا جان! کفن تو نئے کپڑے کا پہنایا جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا: عائشہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا)! نئے کپڑوں کی ضرورت مردوں سے زیادہ زندہ لوگوں کو ہوتی ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی۔ آپ دو سال تین ماہ اور گیارہ دن خلیفہ رہے۔ آپ کو رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

عدلِ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

دونوں جوان حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی محفل میں داخل ہوئے اور محفل میں بیٹھے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے:

یا عمر! یہی ہے وہ شخص

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا اس شخص نے کوئی جرم کیا ہے؟

یا امیر المؤمنین! یہ شخص ہمارے باپ کا قاتل ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا اس شخص نے تمہارے باپ کو قتل کیا ہے؟

دونوں جوان بیک زباں ہو کر بولے: جی ہاں امیر المؤمنین! اس شخص نے ہمارے باپ کو قتل کیا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس شخص سے مخاطب ہو کر پوچھتے ہیں: کیا یہ دونوں نوجوان سچ کہہ رہے ہیں؟

ہاں امیر المؤمنین! مجھ سے ان کے باپ کا قتل ہو گیا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تم نے کیوں اُسے کیوں قتل کیا؟

وہ شخص بولا: اے امیر المؤمنین! ان کا باپ اُونٹ سمیت میرے کھیت میں گھس گیا تھا۔ میرے منع کرنے پر بھی اُس نے اپنا اُونٹ باہر نہ نکالا تو مجھے غصہ آگیا۔ میں نے پتھر اٹھا کر جو مارا تو وہ سیدھا اُس کے سر میں لگا اور وہ موقع پر ہی مر گیا۔ یہ سب اتفاقاً ہو گیا حالانکہ میری نیت ہرگز یہ نہ تھی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے شخص! تُم نے جرم قبول کر لیا ہے اس لئے اب قصاص تو دینا ہی پڑے گا اور اس کا قصاص موت کی سزا ہے۔

یہ مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فیصلہ تھا جن کے عدل کی دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ اُس شخص نے اپنا جرم قبول کر لیا تھا اس لئے بحث کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اُس شخص سے اُس کے خاندان، کنبے اور قبیلے کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا گیا۔ کیونکہ اللہ کے دین میں مجرم کے خاندان یا قبیلے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ انصاف جرم دیکھ کر مجرم کو سزا دیتا ہے۔ مجرم کے خاندان یا قبیلے سے انصاف کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

مجرم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا: اے امیر المؤمنین! میں اپنا جرم تسلیم کرتے ہوئے آپ کا فیصلہ تسلیم کرتا ہوں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ مجھے اتنی اجازت دیں کہ میں صحرا میں جا کر اپنے بیوی بچوں کو اس صورتحال سے آگاہ کر دوں، کیونکہ اُن کا اللہ اور میرے سوا کوئی آسرا نہیں ہے۔ اس کے بعد میں واپس آ کر سزا کیلئے تیار ہوں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اے اجنبی! یہاں تو تیرا کوئی جاننے والا بھی نہیں ہے تو پھر اس بات کی ضمانت کون دے گا کہ تو صحرا سے واپس آجائیگا؟

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بات سُن کر اجنبی پریشان ہو گیا کیونکہ مجمع میں ایک بھی شخص ایسا نہ تھا کہ جو اُس کا نام تک بھی جانتا ہو۔ مجمع پر بھی خاموشی طاری ہو گئی کیونکہ اُن میں سے کوئی بھی اُسے نہیں جانتا تھا اور پھر یہاں کسی سودے یا ادھار کا معاملہ نہیں تھا۔ یہاں تو ضمانت دینے کا مطلب یہ تھا کہ اگر اجنبی مقررہ مدت میں واپس نہ آیا تو ضمانت دینے والے کی گردن اُڑادی جائیگی۔ مجمع میں کوئی بھی شخص ایسا نہ تھا کہ جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فیصلے سے اختلاف کرے یا پھر اجنبی کی سفارش کرے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود بھی کشمکش میں تھے کہ کیا قصاص میں اجنبی کو قتل کر کے اس کے بیوی بچوں کو بھوکا مرنے کیلئے چھوڑ دیا جائے؟ یا پھر اجنبی کو بغیر ضمانت کے جانے دیا جائے۔ اگر وہ واپس نہ لوٹا تو نہ صرف مقتول کا خون رائیگاں جائیگا بلکہ میرے کئے ہوئے فیصلے پر عمل درآمد بھی نہیں ہو سکے گا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سر جھکائے افسردہ بیٹھے تھے پھر انہوں نے نوجوانوں سے درخواست کی کہ اس شخص کو معاف کر دو۔ نوجوان بولے: نہیں امیر المومنین! ہم اپنے باپ کے قاتل کو معاف نہیں کر سکتے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجمع کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز سے پکارا: اے لوگو! کیا تم میں سے کوئی اس شخص کی واپسی کی ضمانت دے سکتا ہے؟

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اجنبی کی بے بسی دیکھی نہ گئی اور کھڑے ہو کر بولے: اے عمر! میں اس شیخ کی ضمانت دیتا ہوں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بولے: ابوذر! کیا تم جانتے ہو کہ اس شخص نے قتل کیا ہے اور اگر یہ واپس نہ لوٹا تو اس کے بدلے میں تمہاری گردن اُڑادی جائیگی؟

ابوذر رضی اللہ عنہ بولے: اے عمر! میں اس ضمانت کا مفہوم اچھی طرح جانتا ہوں اور میں سوچ سمجھ کر ہی اس شخص کی ضمانت دے رہا ہوں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بولے: اے ابوذر! کیا تم اسے جانتے ہو؟

نہیں: امیر المومنین! میں اس شخص کو نہیں جانتا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بولے: تو پھر تم اس کی ضمانت کیوں دے رہے ہو؟

ابوذر رضی اللہ عنہ بولے: میں نے اس شخص کے چہرے پر مومنوں کی صفات دیکھی ہیں۔ اس کا چہرہ بتا رہا ہے کہ یہ شخص سچ بول رہا ہے اور انشاء اللہ

ضرور واپس لوٹ کر آئیگا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بولے: ابوذر! اب بھی وقت ہے اچھی طرح سوچ لو کہ اگر یہ شخص تین دن میں واپس لوٹ کر نہ آیا تو مجھے تیری جدائی کا صدمہ سہنا پڑے گا۔

ابوذر رضی اللہ عنہ بولے: اے امیر المومنین! اگر یہی میری قسمت میں لکھا ہے تو پھر مجھے اپنے رب کا یہ فیصلہ قبول ہے۔

وہ شخص تین روز کی مہلت پا کر وہاں سے رخصت ہوا تاکہ وہ اپنے ضروری کام نبٹا کر اور اپنے بیوی بچوں سے الوداعی ملاقات کر کے مقررہ مدت میں واپس لوٹ سکے۔

ان تین دن اور تین راتوں میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس بات کو ایک لمحہ بھی نہ بھلا پائے، آخر کار وعدے کی آخری گھڑیاں آ پہنچیں۔ عصر کے وقت شہر میں قصاص کی منادی کرا دی گئی۔ لوگوں کا مجمع جمع ہو چکا تھا۔ مقتول کے دونوں بیٹے بھی باپ کے قصاص کیلئے آچکے تھے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ بھی آکر امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے بیٹھ گئے۔

مہلت ختم ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں تھی۔ محفل میں موجود ہر شخص اور خود حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی مضطرب تھے کہ اگر وہ شخص واپس نہ لوٹا تو کیا ابوذر یہ قصاص چکائیں گے۔ یہی سوچ کر ہر کوئی پریشان تھا اور محفل میں سکوت طاری تھا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مزید ضبط نہ ہو سکا تو اضطرابی کیفیت میں بولے: ابوذر! کہاں ہے وہ شخص؟

ابوذر رضی اللہ عنہ بولے: امیر المومنین! مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔

سورج غروب ہونے کو تھا اور وقت کے لمحات کچھ زیادہ تیزی سے سمٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ محفل میں ہو کا عالم طاری تھا اور اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ اب کیا ہو نیوالا ہے؟

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دل میں صحابی رسول ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اتنا احترام تھا کہ اُن کیلئے جان لٹانے میں بھی ایک لمحہ دیر نہ کرتے مگر یہاں معاملہ شریعت کا تھا۔ جب اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے احکام کی پیروی کرنی ہو تو پھر پائے استقامت میں لرزش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا چاہے سامنے اُن کا اپنا بیٹا ہی کیوں نہ ہو؟ اور فاروق یعنی عدل کرنیوالے کا لقب انہیں اللہ کے رسول ﷺ نے عطا کیا تھا اور اس کی لاج تو عمر جان دیکر بھی ضرور رکھتا۔

سورج نظروں سے اوجھل ہونے کو تھا اور کچھ ہی لمحوں میں اذانِ مغرب ہونے کو تھی۔ اچانک وہ شخص حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے حاضر ہو گیا اور خاموش مجمع سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اُس شخص سے مخاطب ہو کر بولے: اے شخص! اگر تو لوٹ کر نہ بھی آتا تو تیرا کیا بگاڑ سکتے تھے۔ کیونکہ ہمیں

تیرے گھریاٹھکانے کا کوئی پتہ نہیں تھا؟

وہ شخص بولا: امیر المومنین! یہ بات میری اور آپکی نہیں تھی۔ میں قانون سے توبیخ جاتا مگر قانون بنانے والے اللہ کی ذات سے کیسے چھپ سکتا تھا۔ مجھ سے جرم سرزد ہوا ہے جبکہ میری نیت ایسی نہ تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ میرے ایسا کرنے سے کوئی یہ نہ کہہ دے کہ اب لوگوں میں سے وعدوں کا ایفاء ہی اٹھ گیا ہے۔

امیر المومنین: دیکھ لیجئے! میں اپنا وعدہ وفا کرنے آگیا ہوں۔ اپنے بچوں کو صحرا میں تنہا چھوڑ کر، جہاں نہ کوئی سایہ دار درخت ہے اور نہ پانی کا نام و نشان۔ ہاں مگر اللہ تو ہے جو ان کا نگہبان ہو گا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا: اے ابوذر! تم نے اس شخص کی ضمانت کس وجہ سے دی؟ ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے عمر! مجھے اس بات کا ڈر تھا کہیں کوئی یہ نہ کہہ دے کہ اب لوگوں سے خیر ہی اٹھالی گئی ہے۔

امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نوجوانوں سے مخاطب ہو کر پوچھا: بولو اب تم کیا کہتے ہو؟

دونوں نوجوان روتے ہوئے بولے: اے امیر المومنین! ہم اس شخص کی صداقت کی وجہ سے اسے معاف کرتے ہیں کیونکہ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں کوئی یہ نہ کہہ دے کہ اب لوگوں میں سے عفو اور درگزر ہی اٹھالیا گیا ہے۔

نوجوانوں کی بات سن کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بے اختیار پکار اٹھے: اللہ اکبر! انکی آنکھوں سے نکلے آنسوؤں سے انکی داڑھی تر ہو گئی اور فرمایا:

اے نوجوانو۔ تمہاری عفو و درگزر پر اللہ تمہیں جزائے خیر دے۔

اے ابوذر۔ اللہ تجھے اس شخص کی مصیبت میں مدد پر جزائے خیر دے۔

اور اے شخص۔ اللہ تجھے اس وفائے عہد و صداقت پر جزائے خیر دے۔

اور اے عمر! اللہ تجھے تیرے عدل و رحمت پر جزائے خیر دے۔

(یہ واقعہ "صحابہ کے واقعات" سے لیا گیا ہے۔)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رعایا سے برتاؤ

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوسرے خلیفہ تھے۔ آپ کا نسب نویں پشت پر رسول اللہ ﷺ سے جاملتا ہے۔ کعب کے دو بیٹے مرہ اور عدی تھے۔ رسول اللہ ﷺ کا نسب مرہ سے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نسب عدی سے ملتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اُن کیلئے رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ اُنہیں شرفِ اسلام سے بہرہ مند فرما۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی دعا منظور فرمائی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلام قبول کرتے ہی یہ اعلان فرمایا کہ آج سے ہم الاعلان حرم کعبہ میں نماز ادا کریں گے۔ پہلے خلیفہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوسرے خلیفہ بنے۔ خلافت کا منصب ملا تو رُعب اور دبدبے والا عمر قوم کا خادم بن گیا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اکثر راتوں کو گشت کیا کرتے تھے۔ ایک رات گشت کرتے ہوئے آپ ایک میدان سے گزر رہے تھے کہ وہاں پر ایک خیمہ لگا دیکھا۔ آپ خیمے کے قریب گئے باہر ایک آدمی بیٹھا تھا اور اندر سے کسی کے کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ آپ آدمی کے پاس بیٹھ گئے اور پوچھا: اے جوان! تُم کون ہو اور یہاں پر قیام کیسا؟

خیمے والے آدمی نے اپنا ہمدردپا کر بتایا۔ میں جنگل کا رہنے والا ہوں اور یہاں مسافر ہوں۔ میں امیر المومنین کے پاس جا کر کچھ مدد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ آپ نے پوچھا: اے اجنبی! یہ خیمے کے اندر سے کیسی آواز آرہی ہے؟ وہ بولا: بھائی جاؤ اپنا کام کرو۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بولے: دوست! یوں لگتا ہے کہ خیمے اندر کوئی تکلیف میں ہے۔ مجھے بتاؤ کہ شاید میں تمہارے کچھ کام آسکوں؟

اجنبی مسافر بولا: خیمے کے اندر میری بیوی ہے اور بچے کی ولادت قریب ہے، اس لئے وہ درد کی کیفیت میں ہے۔

آپ نے پوچھا: کیا مدد کیلئے کوئی دوسری عورت موجود ہے؟ وہ بولا: نہیں خیمے میں اور کوئی نہیں ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بولے: اچھا دوست! میں کچھ انتظام کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر آپ اُٹھے اور سیدھے گھر تشریف لے گئے۔ آپ نے اپنی بیوی حضرت اُم کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا: آج اللہ تعالیٰ نے ثواب کا ایک اچھا موقع دیا ہے۔ یہ کہہ کر آپ نے سارا واقعہ سنایا اور پوچھا: کہو! تمہارا کیا ارادہ ہے؟

حضرت اُم کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا بولیں: میں تو آپ کے حکم کی پابند ہوں۔ آپ نے فرمایا: چلو پھر جلدی سے ضرورت کی چیزیں لے لو تاکہ ہم اُن کے کام آسکیں۔

حضرت اُم کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جلدی سے ایک ہنڈیا، گھی اور ضرورت کی کچھ چیزیں اپنے ساتھ لے لیں اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ چل دیں۔

آپ خیمے کے پاس پہنچے تو حضرت اُم کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو خیمے کے اندر بھیج دیا۔ وہ ہنڈیا چولہے پر چڑھا کر خیمے کے اندر چلی گئیں اور عورت کی مدد کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے اندر سے پکارا: یا امیر المومنین! اپنے دوست کو مبارکباد دیں کہ اللہ نے انہیں بیٹا عطا کیا ہے۔ اجنبی مسافر جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ہی بیٹھا تھا، امیر المومنین کا نام سنتے ہی چونک گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جس شخص سے وہ اتنا کچھ کہہ گیا، وہ امیر المومنین ہے۔ وہ کچھ گھبرا سا گیا۔

حضرت اُم کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بچے کی ولادت سے فارغ ہو کر عورت کو کھانا کھلایا اور بچے ہوئے کھانے کی ہنڈیا خیمے کے باہر رکھ دی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اجنبی مسافر سے فرمایا: دوست! گھبرانے کی ضرورت نہیں، لو تم بھی کچھ کھانا کھاؤ۔ تم نے رات جاگتے ہوئے گزاری ہے۔ تم لوگ اب آرام کرو اور صبح میرے پاس آجانا۔ تمہاری ضرورت پوری کر دی جائے گی۔ یہ کہہ کر آپ حضرت اُم کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو لیکر گھر تشریف لے آئے۔

ایک بمثال مسلمان خلیفہ

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دورِ حکومت تھا۔ آپ نے عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سربراہی میں ایک لشکرِ فلسطین کی طرف روانہ کیا تاکہ بیت المقدس کو اسلامی سلطنت میں شامل کیا جاسکے۔ فلسطین میں عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقابلہ مشہور رومی جرنیل اطرابون سے تھا۔ اطرابون کا لشکرِ فلسطین کے شہر "اجنادین" میں تھا۔ عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اجنادین کا محاصرہ کر کے اطرابون کو بیت المقدس کی طرف دھکیل دیا۔ رومی فوجیں رملہ اور بیت المقدس میں جمع ہو گئیں۔ اطرابون نے عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک دھمکی آمیز خط لکھا کہ تم محاصرہ اٹھا کر واپس چلے جاؤ، تم فلسطین کو فتح نہیں کر سکتے۔ عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اطرابون کو جواباً لکھا کہ میں اس ملک کا فاتح ہوں، تم اپنے ساتھیوں سے مشاورت کر لو تاکہ تم ممکنہ تباہی سے بچ سکو۔ اطرابون عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جواب پر خوب ہنسا اور جواب دیا کہ تم بیت المقدس کے فاتح نہیں ہو سکتے۔ بیت المقدس کے فاتح کا نام تو "عمر" ہے اور یہ تو راایت میں لکھا ہوا ہے۔ عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صورِ تحال سے آگاہ کیا۔

اس دوران اطرابون اور بیت المقدس کا پادری صفرینوس قلعہ بند ہو گئے۔ ان حالات کا جائزہ لے کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود بیت المقدس کے سفر کا ارادہ کیا۔ ادھر پادری نے صلح کی درخواست کی کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود تشریف لائیں اور ہم سے صلح کریں۔ اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خط لکھا کہ بیت المقدس کی آزادی آپ کی تشریف آوری پر موقوف ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنا نائب مقرر کیا۔ اور 16 ہجری 637ء کو آپ بیت المقدس روانہ ہو گئے۔ ابن اثیر وغیرہ نے لکھا ہے کہ آپ نے اونٹنی پر سفر کیا۔ اور اونٹنی پر دو تھیلے تھے۔ ایک میں ستوا اور دوسرے میں کھجوریں تھیں۔ اور سامنے پانی سے بھرا ہوا مشکیزہ تھا۔ سفر لمبا تھا۔ اس لیے ایک غلام کو ساتھ لیا۔ اور اس غلام سے فرمایا یہ مت سمجھنا کہ تمام راستہ میں سواری پر بیٹھ کر آرام سے سفر کرتا رہوں گا اور تم پیدل چلتے رہو گے۔ کیونکہ یہ انصاف کے خلاف ہے۔ اور مقامِ جابیہ پر صلح نامہ تیار ہوا۔ اور رومی حکومت کا نمائندہ بھی موجود تھا۔ اتنے میں اطلاع ہو گئی۔ کہ امیر المومنین تشریف لارہے ہیں۔ سیدنا ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ استقبال کے لیے تشریف لے گئے۔ پادری صفرینوس کا خیال تھا کہ امیر المومنین کالاؤ لشکر نظر آئے گا۔ مگر اُس نے جو دیکھا کہ ایک آدمی اونٹنی پر بیٹھا اُن کی طرف آرہا ہے۔ اور دوسرا اونٹنی کی نکیل پکڑے آگے چل رہا ہے۔

پادری صفرینوس نے پوچھا: امیر المومنین کہاں ہیں۔

بتایا گیا کہ یہ سامنے وہی تو آرہے ہیں۔

صفربنوس نے حیرانی سے پوچھا: کہ یہ اونٹ سوار شخص تمہارا امیر المومنین ہے؟

جواب ملا: نہیں اونٹ سوار نہیں بلکہ ہمارے امیر المومنین تو وہ ہیں جو اونٹ کی رسی تھامے آگے چل رہے ہیں۔ ہمارا دین ہمیں مساوات کا درس دیتا ہے اور ہمارے دین میں سب کے حقوق برابر ہیں۔

صفربنوس منہ میں انگلی دبائے حیرانی سے دیکھ رہا تھا:

یہ امیر المومنین عمر ہے۔ جوتے پھٹے ہوئے، بالوں پر گرد و غبار، پیوند لگا کرتا، ایک دو نہیں پورے سترہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ جن میں سے کچھ پیوند چمڑے کے تھے۔

ہماری کتاب میں فاتح بیت المقدس کی یہی نشانیاں درج ہیں۔ یہ کہتے ہوئے صفربنوس نے بیت المقدس کی چابیاں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے کر دیں۔

صفربنوس سوچ رہا تھا کہ جو باتیں میں کتابوں میں پڑھا کرتا تھا وہ حقیقت آج میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ واقعی ایک اچھا حکمران ایسا ہی ہوتا ہے۔ جس معاشرے میں ایسا انصاف ہو اُس کے حکمران کو کوئی کیسے شکست دے سکتا ہے۔

ہمارے آج کے حکمران مسلمانوں کی ناکامیوں کی منہ بولتی تصویر ہیں: ذرا سوچئے!

خلیفۃ المسلمین کا رعایا سے سلوک

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ کا دورِ خلافت تھا۔ شدید سردی کی رات تھی اور آپ حسبِ معمول گشت پر تھے۔ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ آپ کے ہمراہ تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ آگ جلتے ہوئے دیکھی تو وہاں تشریف لے گئے۔ وہاں ایک عورت اپنے تین بچوں کیساتھ بیٹھی تھی۔ بچے زار و قطار روئے جا رہے تھے۔ ایک بچہ روتے ہوئے بولا: امی جان! خدا را ہمیں کچھ کھانے کیلئے دیں۔ دوسرا بچہ روتے ہوئے بولا: امی جان! لگتا ہے یہ بھوک ہماری جان لیکر چھوڑے گی۔ تیسرا بچہ کہنے لگا: امی جان! کیا مرنے سے پہلے مجھے کچھ بھی کھانے کو نہیں ملے گا؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ آگ کے قریب بیٹھ گئے اور عورت سے پوچھا: یہ سب کیا ہے؟ تمہاری اس حالت کا ذمہ دار کون ہے؟

عورت بولی: اللہ کے بندے! میری اس حالت کا ذمہ دار شخص عمر ہے جو امیر المومنین کہلاتا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا کسی نے تمہاری اس حالت سے امیر المومنین کو آگاہ کیا ہے؟

عورت بولی: یہ کیسا حکمران ہے کہ جسے اپنی رعایا کی کچھ خبر نہیں؟

عورت کے جواب نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ آپ فوراً اٹھے اور بیت المال پہنچے۔ بیت المال کے افسر سے دروازہ کھلوا دیا اور بیت المال سے آٹے کی بوری، گھی اور شہد کا ڈبہ نکالا اور بیت المال کے محافظ سے بولے: یہ آٹے کی بوری میری پیٹھ پر رکھ دو۔ محافظ بولا: یا امیر المومنین! آپ تھک کر ہیں تو میں یہ سامان لیکر آپ کیساتھ چلتا ہوں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ بولے: کیا تم قیامت کے روز بھی میرے گناہوں کا بوجھ اٹھاؤ گے؟ یہ کہہ کر آپ نے سامان اپنی پیٹھ پر لاد دیا اور عورت کے پاس پہنچے۔ عورت کھانا تیار کرنے لگی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ بھی وہیں بیٹھ گئے۔ جب کھانا تیار ہو گیا تو آپ نے گھی اور شہد کے ساتھ بچوں کو اپنے ہاتھوں سے کھلایا۔ یہ منظر دیکھ کر عورت بولی: اللہ کی قسم! تم عمر سے زیادہ اس خلافت کے حقدار ہو جو یتیم بچوں کو اپنے ہاتھوں سے نوالے کھلا رہے ہو۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے عورت! تو کل خلیفہ عمر کے پاس جانا، میں اُس سے تمہارے متعلق بات کرونگا۔ یہ کہہ کر آپ اٹھے اور قریب ہی ایک چٹان پر بیٹھ گئے اور بچوں کو دیکھنے لگے۔

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ بولے: یا امیر المومنین! شدید سردی ہو رہی ہے، آئیں واپس چلتے ہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ بولے: عبدالرحمن! اللہ کی قسم! میں اُس وقت تک یہاں سے نہیں اٹھوں گا کہ جب تک ان یتیم بچوں کے چہروں پر مسکراہٹ نہ دیکھ لوں۔

دوسرے روز عورت دربار میں پہنچی تو دیکھا کہ سامنے وہی شخص بیٹھا ہے اور اُس کے ایک جانب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ اور دوسری جانب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ بیٹھے ہوئے ہیں اور دونوں رات والے شخص کو امیر المومنین کہہ کر مخاطب کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر عورت پریشان ہو گئی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ نے عورت کو اپنے پاس بلایا اور بولے: اے عورت! پریشان مت ہو، اور بتا کہ تیری اس شکایت کی کیا قیمت ہے؟ عورت بولی: یا امیر المومنین! مجھے معاف کر دیں کہ میں انجانے میں نہ جانے کیا کچھ بول گئی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ نے عورت سے فرمایا: اللہ کی بندی! تیرا کوئی قصور نہیں، قصور تو عمر کا ہے جو تیری حالت زار سے بے خبر رہا، مجھے بتا کہ تو اپنی اس شکایت کا کیا عوض لے گی؟

عورت بولی: امیر المومنین! مجھے معاف کر دیجیئے، مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ کی قسم! جانے سے پہلے تجھے اپنی شکایت میرے ہاتھ فروخت کرنا ہوگی۔

بالآخر عورت اپنی شکایت چھ سو درہم کے عوض حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بیچنے کیلئے تیار ہو گئی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ نے عورت کو چھ سو درہم دیئے اور پھر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ سے تحریر لکھوائی اور ابن مسعود نے گواہی دی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ نے وصیت فرمائی کہ یہ تحریر میری وفات کے بعد میرے کفن میں رکھ دینا، تاکہ میں اللہ کے سامنے یہ گواہی لیکر جاؤں۔

مسلمان حکمران ایسے ہوتے ہیں!!!

حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایمان

لشکرِ اسلام روم کی جانب پیش قدمی کر رہا تھا۔ یہ اطلاع قیصر روم تک پہنچائی گئی تو اُس نے اپنی فوج کو مقابلہ کیلئے بھیجتے ہوئے حکم دیا کہ مسلمانوں کو قتل کرنے کی بجائے گرفتار کر لیا جائے۔ جنگ ختم ہوئی تو رومی فوجی چند مسلمان قیدیوں کو لیکر قیصر روم کے پاس آئے۔

قیصر روم نے ایک نظر قیدیوں پر ڈالی تو دیکھا کہ اُن میں ایک قیدی ایسا ہے جسے سپاہیوں نے زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔ قیصر روم کو یہ قیدی بہادر اور ذہین لگا اور اُس نے سوچا کہ یہ قیدی سب سے قیمتی لگ رہا ہے۔ وہ اُٹھ کر قیدیوں کے پاس آگیا۔ سب مسلمان قیدی قیصر روم کے سامنے ایسے کھڑے تھے کہ اُن کے چہروں پر نہ تو کوئی خوف تھا اور نہ ہی رنج و ملال۔ وہ چلتے چلتے زنجیروں میں جکڑے قیدی کے پاس آگیا اور اُسے مخاطب کرتے ہوئے بولا: اے شخص! تم مجھے معزز و بہادر انسان لگتے ہو۔ تم اسلام چھوڑ کر عیسائیت اختیار کر لو، ہم تمہیں عزت و احترام اور بلند مرتبے سے نوازیں گے۔

قیدی بولا: میرا مذہب اسلام سب مذاہب سے بڑھ کر ہے۔ میں اپنا دین چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ بادشاہ نے ہمت نہ ہاری اور بولا: اے بہادر انسان اگر تم میرا مذہب اختیار کر لو گے تو میں نہ صرف تمہیں اپنی حکومت میں حصے دار بنالوں گا بلکہ اپنی بیٹی سے تمہاری شادی بھی کر دوں گا پھر دُنیا کی ہر نعمت تمہارے قدموں میں ہوگی۔

قیدی نے سوچا کہ قیصر روم دُنیا کی نعمتوں اور آسائشوں سے میرے ایمان کا سودا کرنا چاہتا ہے۔ وہ بولا: میں کسی بھی قیمت پر اپنے ایمان کا سودا نہیں کر سکتا۔

قیصر روم نے اپنی پیشکش ٹھکرائے جانے پر بے عزتی محسوس کی اور غضبناک لہجے میں بولا: تمہاری اس گستاخی پر میں تجھے قتل بھی کر سکتا ہوں۔

قیدی بولا: اگر میرے اللہ نے میری موت تمہارے ہاتھوں لکھی ہے۔ تو میں اللہ کی رضا پر راضی ہوں۔

قیدی کا جواب اور بے خوفی دیکھ کر قیصر روم بھڑک اُٹھا اور بولا: قیدی کو تختہ دار پر لٹکا کر تیروں سے چھلنی کر دیا جائے۔

بادشاہ کے حکم کی تعمیل ہوئی اور قیدی کو تختہ دار پر لٹکا کر تیروں سے چھلنی کیا جانے لگا۔ قیدی کے صبر و استقامت کو دیکھ کر وہ اور جلال میں آگیا اور حکم دیا کہ رکو: پہلے دوسرے قیدیوں کو ایک ایک کر کے کھولتے ہوئے تیل میں پھینکو۔

بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں دو قیدیوں کو کھولتے ہوئے تیل میں پھینک دیا گیا۔ مجمع میں ہر کسی پر خوف طاری تھا۔ قیصر روم نے قیدی سے کہا: میں تمہیں ایک موقع اور دیتا ہوں کہ تم عیسائیت اختیار کر کے اپنے باقی دوستوں کی زندگیاں بچالو۔

قیدی کے چہرے پر خوف کی کوئی علامت نہیں تھی، اُس نے بادشاہ کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ اب تو قیصر روم غصے سے پاگل ہو گیا اور حکم دیا کہ اس قیدی کو بھی کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیا جائے۔

بادشاہ کے کارندے جب قیدی کو تیل میں ڈالنے کیلئے لے جا رہے تھے تو انہوں نے دیکھا کہ قیدی کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے ہیں۔ کارندوں نے فوراً بادشاہ کو بتایا۔ قیصر روم نے سوچا کہ قیدی موت سے ڈر گیا ہے۔ وہ اُٹھ کر قیدی کے قریب آگیا اور بولا: اے شخص! میں جانتا ہوں کہ تمہارا جسم

میرا عذاب سہنے کی سکت نہیں رکھتا، اس لئے اب بھی وقت ہے کہ تم عیسائیت اختیار کر کے خود کو اور اپنے ساتھیوں کو دردناک موت سے بچالو۔

قیدی بولا: اے بادشاہ! تو سوچتا ہے کہ میں موت سے ڈر گیا ہوں اور خوف سے آنسو بہا رہا ہوں۔ سنو! مجھے موت کی اذیت کا کوئی خوف نہیں۔ میں تو

اس لئے رو رہا ہوں کہ میں ایک جان اپنے اللہ پر قربان کر رہا ہوں۔ کاش میرے پاس اور جانیں بھی ہوتیں تو میں ایک ایک کر کے سب اپنے اللہ پر قربان کر دیتا۔

قیدی کا جواب سن کر قیصر روم جان گیا کہ مسلمان ناقابلِ تسخیر قوم ہے، مسلمان نہ بک سکتا ہے اور نہ ہی جھک سکتا ہے۔ اپنی انا کا بھرم رکھنے کیلئے قیصر روم بولا: اے شخص! اگر تم میرے سر کا بوسہ لے لو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو رہا کر دوں گا۔

قیدی نے سوچا کہ میرے بوسہ لینے سے میرے ایمان میں کوئی فرق نہیں آئیگا، اور اس طرح میں اور میرے ساتھی آزادی اور زندگی جیسی نعمت سے سرفراز ہو جائیں گے۔ قیدی نے آگے بڑھ کر بادشاہ کے سر کا بوسہ لے لیا اور بادشاہ نے اپنے وعدے کے مطابق قیدی اور اُس کے ساتھیوں کو رہا کر دیا۔ قیدی اپنے ساتھیوں سمیت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا اور قیصر روم کے دربار میں پیش آنیوالا واقعہ سنایا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قیدی کی بات سن کر اتنا پیار آیا کہ انہوں نے بے اختیار آگے بڑھ کر اُس کا سر چوم لیا۔

یہ شخص صحابی رسول اللہ ﷺ حضرت عبد اللہ بن حذافہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے کہ جنہوں نے اپنی دانشمندی کے ساتھ اپنے ایمان اور زندگیوں کو بچا لیا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایمان و استقامت عطا فرمائے۔ آمین، ثم آمین (یہ واقعہ ابنِ کثیر سے لیا گیا ہے)

خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سادگی

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دورِ خلافت تھا۔ مسلمان فوجیں جن ملکوں اور سلطنتوں کی طرف رُخ کرتیں، اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑ دیتیں۔ قیصر روم بھی گھبرا گیا اور اُس نے اپنا ایک آدمی مدینہ کے حالات کا جائزہ لینے کیلئے بھیجا۔ وہ آدمی مدینہ پہنچا تو لوگوں سے پوچھنے لگا کہ تمہارے شہنشاہ کا محل کہاں ہے؟

لوگوں نے کہا: ہم نہیں جانتے کہ شہنشاہ کیا ہوتا ہے، تم یہ بتاؤ کہ کس سے ملنا چاہتے ہو؟

وہ آدمی بولا: میں تمہارے بادشاہ سے ملنا چاہتا ہوں۔

لوگ بولے: ہمارے ہاں کوئی بادشاہ نہیں ہوتا۔ ایک خلیفہ ہوتا ہے جو ہم سب کا خادم ہوتا ہے۔ وہ ہمارے سب کاموں اور امورِ سلطنت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ ہمارے خلیفہ کا نام "عمر" ہے اور وہ ایک جھوپڑے میں رہتا ہے، ہمارے خلیفہ محلوں میں نہیں رہتے اور اس وقت وہ کہیں مزدوری وغیرہ کر رہا ہو گا۔

وہ شخص بڑا حیران ہوا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔ کسی نے بتایا کہ اگر تم عمر سے ملنا چاہتے ہو تو جاؤ وہ فلاں درخت کے نیچے سو رہا ہے۔

وہ شخص اُس درخت کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ درخت کے نیچے زمین پر سو رہے ہیں۔ پہلے تو وہ حیران ہوا اور پھر بولا: کیا یہی وہ عمر ہے کہ جس کی ہیبت سے زمانے کے شہنشاہوں کی نیندیں اڑی ہوئی ہیں؟

پھر وہ بولا: اے عمر! تو نے اپنے لوگوں سے انصاف کیا اور اب نہ تو تیرے ضمیر پر کوئی بوجھ ہے اور نہ تجھے کوئی فکر۔ اسی لئے تو آج ریت کے بچھونے پر بے فکر سو رہا ہے۔

ہمارے شہنشاہ ظالم اور بد دیانت لوگ ہیں، اس لئے انہیں پہریداروں کے حصار میں بڑے بڑے محلات میں بھی نیند نہیں آتی۔

کیا آج ہمارے حکمرانوں کو بڑے بڑے محلوں کے بیڈروموں میں نرم اور دبیز گدوں پر چین کی نیند آتی ہے؟ ذرا سوچئے؟

اللہ تو دیکھ رہا ہے

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے غلام نافع سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ چند ساتھیوں کے ہمراہ مدینہ کے نواح میں سفر کر رہے تھے کہ انہیں بھوک لگ گئی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھیوں نے مناسب سی جگہ دیکھ کر دسترخوان بچھایا اور سب لوگ کھانا کھانے لگے۔ اتنے میں وہاں سے ایک چرواہے کا گڈر ہوا جو بکریوں کا ریوڑ لئے جا رہا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: اے چرواہے! آؤ تم بھی ہمارے ساتھ کچھ کھا پی لو۔

چرواہا بولا: میں آپ کے ساتھ کھانے میں شامل نہیں ہو سکتا، کیونکہ میں روزے سے ہوں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: چرواہے! سخت گرمی کے اس موسم میں تم روزے کی مشقت برداشت کر رہے ہو؟ اس وقت جبکہ لو بہت تیز ہے اور تم پہاڑوں میں بکریاں چرا رہے ہو۔

چرواہا بولا: محترم! میں یہ سب اُن دنوں کیلئے کر رہا ہوں کہ جن میں مجھے کچھ عمل کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ ایام زندگی کا توازن برقرار رہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ چرواہے کا جواب سُن کر بہت متاثر ہوئے اور سوچا۔ کیوں نہ اس چرواہے سے اس کے تقویٰ اور خوفِ الہی کا امتحان لیا جائے؟ یہ سوچ کر انہوں نے کہا: اے چرواہے! کیا تم اپنے ریوڑ سے ایک بکری ہمیں بیچو گے؟ ہم تمہیں اس کی قیمت ادا کریں گے اور کچھ گوشت بھی افطار کیلئے لے لینا؟

چرواہا بولا: حضور! بکریوں کا یہ ریوڑ میرا نہیں ہے، پھر میں کیسے اپنے آقا کے ریوڑ سے بکری فروخت کر سکتا ہوں۔ میں یہ بے ایمانی نہیں کر سکتا۔ میں اپنے مالک کو کیا جواب دوں گا؟

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بولے: چرواہے! بکریاں چراتے ہوئے کبھی تمہاری کوئی بکری گم بھی ہو جاتی ہوگی، یا پھر بھیڑیا کھا جاتا ہوگا۔ تمہارے آقا کو اس معمولی سے نقصان سے کیا فرق پڑتا ہوگا؟ آج بھی تم کہہ دینا کہ ایک بکری گم ہو گئی ہے۔

اور وہ کونسا تمہیں دیکھ رہا تھا؟

چرواہا بے اختیار بولا: اے اجنبی مسافر! تم کہتے ہو کہ میں اپنے مالک سے جھوٹ بولوں کہ بکری کو بھیڑیا کھا گیا؟ اگر میں ایسا ہی کروں اور میرا مالک میری بات کا یقین بھی کر لے، مگر پھر اللہ کہاں ہے؟ وہ تو مجھے دیکھ رہا ہے۔ میرا مالک تو میری بات کا یقین کر لے گا، مگر میں اللہ کو کیا جواب دوں گا؟ ایسا کر کے میں تمام جہانوں کے مالک کے سامنے شرمسار نہیں ہونا چاہتا۔ یہ کہہ کر چرواہا ریوڑ لے کر چلا گیا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ چرواہے کے جانے کے بعد بار بار یہ الفاظ دُہرا رہے تھے۔ "پھر اللہ کہاں ہے؟ پھر اللہ کہاں ہے؟"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ واپس آئے تو چرواہے کے آقا کو بلوایا اور منہ مانگے دام دیکر چرواہے کو آزاد کروایا اور پھر بکریوں کا ریوڑ خرید کر چرواہے کو ہبہ کر دیا اور فرمایا: یہی لوگ تو دین کی عمارت کے ستون ہیں۔

کاش قوم یہ سمجھ لے کہ اللہ ہماری ہر اچھائی اور برائی کو دیکھ رہا ہے اور وہ یوم حساب پر پورا پورا بدلہ دیگا۔

جذبہ جہاد اور اللہ کا انعام

ولید بن عبد الملک کا دورِ حکومت تھا۔ ابنِ اشعث سے معرکہ آرائی میں حجاج بن یوسف بھی شامل تھا۔ دورانِ جنگ حجاج بن یوسف نے ایک نوجوان قتیبہ بن مسلم کو دیکھا۔ جس میں ایک اچھے سپاہی، ایک بہادر سپہ سالار اور ایک بہترین حکمران کی صلاحیتیں اُڑ رہی تھیں۔ حجاج بن یوسف نے اس نوجوان کی صلاحیتوں کا ذکر ولید بن عبد الملک سے کیا اور عبد الملک نے قتیبہ بن مسلم کو والیِ خراسان (گورنر) مقرر کر دیا۔ ولید بن عبد الملک کے دورِ حکومت میں مسلمانوں نے بہت سے ممالک میں غیر مسلموں کے جھنڈے سرنگوں کر دیئے۔

قتیبہ بن مسلم ایک بہترین اور بہادر سپہ سالار تھا وہ شوقِ جہاد اور فتوحات کے جنون میں چین کی سرحدوں تک جا پہنچا۔ خاقانِ چین سپہ سالار قتیبہ بن مسلم کی فتوحات کو دیکھ کر ہمت ہار بیٹھا۔ اُس نے قتیبہ بن مسلم سے درخواست کی کہ وہ بغیر جنگ کئے بغیر اُن کے تمام مطالبات ماننے کیلئے تیار ہے۔ مگر قتیبہ بن مسلم نے کہا:

خاقانِ چین کو معلوم ہو کہ امیر المومنین سر زمینِ چین کو اپنے قدموں تلے روندنا چاہتے ہیں۔ خاقانِ چین نے کہا کہ میں اپنے ملک کی مٹی سے بھرا ہوا ٹوکرا امیر المومنین کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں۔ وہ اسے اپنے قدموں تلے روند کر اپنی قسم پوری کر لیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور یوں چین مملکتِ اسلامی کے جھنڈے تلے آگیا۔

تاریخِ اسلام فتوحات کے ساتھ ساتھ عبرتناک واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ قتیبہ بن مسلم کو حجاج بن یوسف کی مکمل حمایت حاصل تھی مگر وہ ولید بن عبد الملک کے بیٹے سلیمان کا منظورِ نظر نہ بن سکا۔ سلیمان بن عبد الملک نے قتیبہ کو معزول کر کے یزید بن مہلب کو خراسان کا گورنر مقرر کر دیا۔ قتیبہ نے سلیمان بن عبد الملک کے خلاف بغاوت کر دی مگر فوج نے اُس کا ساتھ نہ دیا اور قتیبہ کو قتل کر کے اُس کا سر ولید بن عبد الملک کے پاس بھیج دیا۔ تاریخِ اسلام کا یہ دردناک المیہ ہے کہ عبد الملک کی سلطنت کو چین تک وسعت دینے والا قتیبہ بن مسلم، ہندوستان میں ملتان تک کا علاقہ اسلامی سلطنت میں شامل کرنے والا نوجوان محمد بن قاسم (حجاج بن یوسف کا بھتیجا) اور سقوطِ قرطبہ (سپین) میں طارق بن زیاد کی مدد کرنے والا موسیٰ بن نصیر تینوں سلیمان بن عبد الملک کے دور میں رقابت اور غلط فہمیوں کی بنا پر قتل کر دیئے گئے۔ موسیٰ بن نصیر کے بارے میں تاریخ میں ابہام پایا جاتا ہے۔

قتیبہ بن مسلم کی فوج میں ایک نوجوان ابو عبد الرحمن فروخ سپاہی تھا۔ جو مدینہ سے جہاد کیلئے فوج میں شامل ہوا تھا۔ فروخ خوبصورت اور کڑیل جوان تھا۔ شوقِ جہاد اُس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور اُس کی خواہش تھی کہ وہ صحابہ کرام اور تابعین کے شانہ بہ شانہ جنگوں میں شریک ہو۔

فروخ کی شادی سہیلہ نامی لڑکی سے ہو گئی جو نہایت خوبصورت، خوب سیرت اطاعت گزار اور فرمانبردار بیوی تھی۔ فروخ کی لمحہ بھر کی جدائی پر وہ ماہی

بے آب کی مانند ہو جاتی۔ سہیلہ کی بہت سی سہیلیاں تھیں جن کے ساتھ اُس نے بچپن سے شادی ہونے تک کا وقت گزارا تھا۔ اب اُس کا سہیلیوں سے ملنا جلنا تقریباً ختم ہو گیا تھا۔

وادیِ عقیق میں اہلِ مدینہ ہر سال ثقافتی جشن مناتے تھے۔ سہیلہ کی سہیلیاں بڑی اُمید سے جشن میں پہنچیں کہ وہ جشن میں ضرور شرکت کریگی۔ جب انتظار طویل ہو گیا تو ایک سہیلی امینہ بولی:

لگتا ہے کہ سہیلہ فروخ کی محبت میں دیوانی ہو گئی ہے۔ اب وہ ہم سے کبھی نہیں مل سکتی۔

سہیلیاں کہنے لگیں: ہم بھی تو شادی شدہ ہیں۔ ہم آپس میں بھی ملتی ہیں اور اپنے شوہروں کے حقوق بھی ادا کرتی ہیں۔

امینہ بولی: سبھی کے شوہر تو فروخ جیسے نہیں ہوتے۔ وہ حسین و جمیل ہی نہیں دولت مند بھی ہے۔ سہیلہ شباب اور دولت کے نشے میں ہمیں بھول گئی ہے۔

وہ باتوں میں مشغول تھیں کہ ایک نوجوان ہتھیار زیب تن کئے اور چہرے کو عمامہ سے ڈھانپنے ہوئے گھوڑا دوڑاتے ہوئے لوگوں کے بیچ سے ہوتا ہوا نخلستان کی وسعتوں میں گم ہو گیا۔ یہ سہیلہ کا شوہر فروخ تھا جسے وہ پہچان نہ سکیں۔

خراسان میں اللہ کیلئے جہاد کا اعلان ہوا تو فروخ بیقرار ہو گیا۔ جذبہ شوقِ شہادت میں اُس نے جہاد کیلئے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سہیلہ جدائی کے غم سے بیقرار ہو رہی تھی۔ اُس نے فروخ کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر اُسے روکنے میں ناکام رہی۔

فروخ نے سہیلہ سے کہا:

دیکھو میں جذبہ شوقِ شہادت لئے ہوئے جہاد میں شرکت کیلئے جا رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ زندہ سلامت لوٹوں یا پھر شہادت کا رتبہ پاؤں۔ میرے پاس تیس ہزار دینار ہیں۔ یہ میں امانتاً تجھے دیئے جا رہا ہوں واپس لوٹ آیا تو اپنی امانت تجھ سے واپس لے لوں گا۔ میں نے حق زوجیت تو ادا کر دیا مگر اللہ کا حق ادا کرنا ابھی باقی ہے۔ بیوی کی منت سماجت کچھ کام نہ آئی اور فروخ اپنی بیقرار بیوی کو شکستہ دل چھوڑ کر چلا گیا۔

اسلامی لشکرِ سمندر کی بیکراں لہروں کی طرح ملکوں اور سلطنتوں کو روندنا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ یورپ، ایشیائے کوچک، افریقہ کے ملکوں شہروں تاشقند، چین، سندھ و ملتان، ہسپانیہ اور حبشہ سب اسلام کے پرچم تلے آ گئے۔ یہ وہ وقت تھا کہ سورج مملکتِ اسلامی سے نکلتا اور اسی میں غروب ہوتا تھا۔ سہیلہ کی سہیلیوں کو معلوم ہوا کہ فروخ جہاد کیلئے چلا گیا ہے تو انہوں نے سہیلہ کی رازدار سہیلی امینہ کو خبر گیری کیلئے بھیجا۔ امینہ نے واپس آ کر بتایا کہ امینہ بہت اُداس اور بے چین رہتی ہے۔ وہ کوئی بات نہیں کرتی، بس آنکھیں موندھے لیٹی رہتی ہے۔ فروخ کا نام آئے تو اُس کا اُداس چہرہ کھل اٹھتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ سہیلہ کیلئے دنیا میں فروخ کے علاوہ اور کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کو سہیلہ کی بے بسی پر رحم آ گیا اور اُسے ایک خوبصورت بیٹی کی ماں بنا دیا۔ آہستہ آہستہ شوہر کی محبت بیٹی کی محبت میں سا گئی۔ مگر پھر بھی وہ

صبح و شام مدینہ کی جانب آنیوالے قافلوں سے فروخ کے بارے میں ضرور دریافت کرتی۔ سہیلہ اپنا اکثر وقت مسجدِ نبوی میں جا کر عبادت میں گزارتی اور بزرگانِ دین کے وعظ سنتی۔ سہیلہ کا بیٹا چلنے لگا تو اُس کی توجہ بچے کی جانب مبذول ہو گئی۔ وہ اُسے اپنے محبوب شوہر کی یادگار سمجھتی تھی۔ بیٹا باتیں کرنے لگا مگر سہیلہ کے پاس اب جمع پونجی ختم ہو چکی تھی اور وہ تنگدستی کے دن گزار رہی تھی۔ اُسے اب بھی امید تھی کہ اُس کا شوہر لوٹ آئیگا اور حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ اپنے بیٹے کو بھی وہ یہی امید دلاتی کہ تمہارا باپ آج نہیں تو کل ضرور لوٹ آئیگا اور پھر ہم اپنی باقی زندگی عیش و عشرت سے گذاریں گے۔

ایک روز وہ حسبِ عادت مدینہ آنیوالے راستے پر بیٹھی قافلے کا انتظار کر رہی تھی کہ ایک قافلہ آ پہنچا۔ سہیلہ نے ایک قافلے والے سے فروخ کے بارے میں پوچھا اور اپنے شوہر کا حلیہ بتایا۔ اُس آدمی نے بتایا کہ میں نے اس حلیے کے ایک شخص کو میدانِ جنگ میں شہید ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ سہیلہ غم کا طوفان اپنے اندر سمیٹے ہوئے مایوس گھر لوٹ آئی۔ پھر اُس نے اللہ سے لو لگائی اور فیصلہ کیا کہ اپنے شوہر کی امانت سے وہ اپنے بیٹے کو دینی تعلیم سے آراستہ کریگی۔ دن، مہینے اور سال بیتتے رہے۔ اسلامی لشکر شہروں، علاقوں اور ملکوں کو فتح کرتے رہے اور آخر کار چین کی سرحدوں تک آ پہنچے اور پھر چین بھی مغلوب ہو گیا۔ اسلامی فوجیں اب اپنے علاقوں میں واپس لوٹنے لگیں تھیں۔

فروخ کو جہاد کی مہم پر روانہ ہوئے ستائیس برس بیت چکے تھے۔ اُس کا ہر دن جہاد میں گذرتا اور شبِ عبادت اور سونے میں گذرتی۔ آج جب وہ عبادت کے بعد بستر پر لیٹا تو اُس کا ذہن ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔ اپنی بیوی کا اُداس چہرہ اور التجائیں اُسے یاد آنے لگیں اور اُس کا دل بیقرار ہو گیا۔ شاید وہ اپنے لشکر کا واحد سپاہی تھا جو کبھی لشکر سے جدا نہ ہوا تھا۔ مگر اب جبکہ جہاد ختم ہو چکا تھا اُسے اپنی بیوی اور گھر کی یاد ستانے لگی۔ پہلے تو وہ جذبہٴ جہاد میں شوقِ شہادت کیلئے سرگرداں تھا۔ مگر اب جبکہ وہ زندہ سلامت ہے تو اُسے اپنی بیوی کے حقوق کیلئے اللہ کے حضور جو ابدہ ہونا پڑیگا۔

فروخ کے دل میں اب کئی وسوسے جنم لینے لگے۔ خدا جانے میری بیوی زندہ بھی ہے کہ نہیں، اگر وہ زندہ ہے تو کیا وہ اپنے وفاداری کے عہد کا پاس کرتے ہوئے میرا انتظار کر رہی ہے یا پھر شیطان نے اُسے بے حیائی کی راہ پر لگا دیا ہے۔ خدا جانے میرے تیس ہزار دینار محفوظ بھی ہیں کہ نہیں؟ اگر میری بیوی اب بھی میرے انتظار میں ہے تو نہ جانے اُس نے ستائیس برسوں میں کتنی تکلیفیں اٹھائی ہوں گی۔ یہ سب سوچیں اُسے پریشان کئے جا رہی تھیں۔

سوچ کا دھارا بدلتا تو اُسے اپنی وفادار بیوی سہیلہ کی رفاقت میں گزرے ہوئے لمحات یاد آنے لگے۔ لطف و سرور کے تصور سے باہر آیا تو اُس کا جی چاہا کہ اُڑ کر مدینہ پہنچ جائے۔ جب وہ مدینہ سے جہاد کیلئے روانہ ہوا تھا تو نوجوان تھا اور اب داڑھی اور سر کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ فروخ کو بیوی اور وطن کی یاد ستانے لگی تو اُس نے امیر لشکر سے واپسی کی اجازت لی اور گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ کی جانب روانہ ہوا۔ دورانِ سفر وہ سوچتا ہوا جا رہا تھا کہ میرے پاس مالِ غنیمت کے چار ہزار دینار ہیں اور تیس ہزار میری بیوی کے پاس امانت رکھے ہوئے ہیں۔ اب میں مدینہ جا کر اپنی زندگی کے باقی دن اپنی بیوی

کے ساتھ رفاقت میں گزاریں گے۔ خیالوں کے تانے بانے بنتا ہوا فروخ دن رات سفر کرتا ہوا مدینہ کی حدود میں پہنچا تو اُسے جبلِ اُحد نظر آنے لگا اور اُس کا دل روضہِ رسول ﷺ تک پہنچنے کیلئے بیقرار ہونے لگا۔ اُن دنوں مسجدِ نبوی کے گنبد اور مینار نہیں بنے تھے۔ وہ گھر کی بجائے سیدھا مسجدِ نبوی پہنچا اور نوافل ادا کئے۔

نوافل کی ادائیگی کے بعد جب فروخ گھر جانے کیلئے اُٹھا تو اُس نے دیکھا کہ ایک جانب حلقے کی شکل میں بہت سے لوگ جمع ہیں۔ وہ قریب گیا تو دیکھا کہ بہت سے معززین ایک شخص کے گرد بیٹھے درس سن رہے ہیں۔ مقرر کا نصف سے زیادہ چہرہ عربی رومال سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس لئے وہ اُسے دیکھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ فروخ بھی مجلس میں بیٹھ کر واعظ سننے لگا۔ اُس شخص کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ اُس کی روح میں اتر رہا تھا۔ اذانِ عصر کیساتھ ہی مجلس برخاست ہو گئی۔ فروخ نے باجماعت نماز ادا کی اور مسجدِ نبوی سے باہر نکلتے ہوئے ایک شخص سے پوچھا:

کیا تم درس دینے والے صاحب کو جانتے ہو؟

وہ آدمی بولا: بڑے تعجب کی بات ہے کہ تم انہیں نہیں جانتے۔ یہ امام ربیعہ الرائے ہیں۔ مگر آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟

فروخ بولا: میں مسافر ہوں اور ابھی ابھی سفر سے آیا ہوں۔ یہ امام ربیعہ الرائے کون ہیں؟

یہ اس شہر کے بڑے امام اور فقیہ ہیں۔ آپ مالک بن انس، سفیان ثوری اور شعبہ کے استاد ہیں اور ان کے حلقہٴ درس میں شہر کے چالیس حدیث کے امام بھی شامل ہیں۔

فروخ گھوڑے پر سوار ہو کر گھر کی جانب روانہ ہوا۔ گھر کے دروازے پر پہنچا اور دستک دی تو ایک حسین و جمیل نوجوان نے دروازہ کھولا اور اُسکی بیوی سہیلہ نوجوان کے پیچھے کھڑی تھی۔ نوجوان نے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا تو غیرت سے فروخ کا خون کھول اُٹھا اور وہ نوجوان کو ڈانٹتے ہوئے گھر میں داخل ہونے لگا۔

فروخ کو گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر نوجوان چلا اُٹھا:

اے اللہ کے دشمن! تو میرے گھر میں بغیر اجازت کیوں گھس رہے ہو؟

ارے اللہ کے دشمن تو تم ہو جو میرے گھر میں میری بیوی کیساتھ موجود ہو۔ فروخ نے جواب دیا۔

جھگڑا طول پکڑنے لگا اور لوگ اکٹھے ہو گئے۔ نوجوان کہہ رہا تھا: "میں تجھے حاکم شہر کے سامنے پیش کروں گا" مجمع کے لوگ بھی نوجوان کی حمایت کرنے لگے کیونکہ اُن میں اکثریت اُس کے شاگردوں کی تھی۔

فروخ بھی سخت طیش میں تھا وہ بولا: ارے واہ! یہ بھی خوب رہی! ایک تو تو میری بیوی کیساتھ میرے ہی گھر میں موجود ہے اور مجھے ہی حاکم شہر کے پاس لے جانا چاہتا ہے۔ میں تو خود تجھے اُس کے پاس لے جاؤں گا تاکہ انصاف حاصل کر سکوں۔

ربیعہ الرائے کے ایک شاگرد نے فروخ سے کہا: محترم! آپ شہر میں کسی دوسری جگہ قیام کر سکتے ہیں۔

فروخ بولا: جناب میں ابو عبد الرحمن فروخ ہوں اور یہ میرا گھر ہے۔

سہیلہ دروازے کیساتھ کان لگائے یہ سب سن رہی تھی۔ اُس نے بیقرار ہو کر دروازہ کھولا اور لوگوں سے مخاطب ہو کر بولی: ابو عبد الرحمن فروخ میرا خاوند ہے اور ربیعہ میرا بیٹا ہے۔ میرا شوہر اُس وقت جہاد فی سبیل اللہ کیلئے چلا گیا تھا۔ جب ربیعہ میرے بطن میں تھا۔ یہ سن کر مجمع چھٹنے لگا اور ربیعہ بھاگ کر اپنے باپ کے سینے سے لگ گیا اور دونوں دیر تک آنسو بہاتے رہے۔ پھر ربیعہ اپنے باپ کو لیکر گھر کے اندر آ گیا۔

بیٹا کسی کام کیلئے گھر سے باہر گیا تو فروخ بولا: سہیلہ! خدا کیلئے مجھے معاف کر دینا۔ جذبہ شوقِ جہاد میں طویل عرصے تک تم سے دور رہا۔ جہاد ختم ہوا تو مجھے تیری یاد ستانے لگی اور میں بیقرار ہو کر چلا آیا۔ میں تم سے بے حد پیار کرتا ہوں۔

سہیلہ: کیا اب بھی؟ جب کہ میں بوڑھی ہو چکی ہوں۔

فروخ بولا: سہیلہ! تیرا اخلاص ہی تیری خوبصورتی ہے۔ تو اب بھی مجھے دنیا کی تمام عورتوں سے زیادہ خوبصورت لگتی ہو۔ کچھ دیر پیار و محبت کی باتیں کرنے کے بعد فروخ چار ہزار درہم سہیلہ کو تھمتے ہوئے بولا: سہیلہ! یہ بھی اُن تیس ہزار دیناروں میں ملا لینا جو میں نے تجھے جہاد پر جانے سے قبل دیئے تھے۔

فروخ کی بات سن کر سہیلہ کچھ توقف کرتے ہوئے بولی: کیا آپ مسجدِ نبوی میں نماز پڑھنے گئے تھے؟

فروخ بولا: ہاں! میں نے وہاں ایک عجیب منظر دیکھا کہ ایک عالم وہاں درس دے رہا تھا اور بڑے بڑے علم والے لوگ اُس کا بیان سن رہے تھے۔ سبحان اللہ! اُس عالم کے منہ سے علم کی برسات ہو رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کاش میں بھی علم حاصل کر کے یہ درجہ اور فضیلت حاصل کرتا۔ سہیلہ بولی: کیا تم تیس ہزار درہم کے عوض عالمِ دین ہونا پسند کرتے؟

فروخ: واللہ! یہ درجہ اور فضیلت۔ کاش میں بھی ایسا ہی عالمِ دین ہوتا؟

سہیلہ: کیا تم اپنے بیٹے کو ایسا عالمِ دین بنانے کیلئے تیس ہزار دینار صرف کرنا پسند کرو گے؟

فروخ: اللہ کی قسم! اگر ایسا ہو جائے تو یہ بھی گھائے کا سودا نہیں ہے۔

سہیلہ: مسجدِ نبوی میں جس عالم کا درس آپ سن کر آئے ہیں وہ آپ ہی کا بیٹا ربیعہ الرائے ہے۔ اور تیس ہزار دینار میں نے اُس کی تعلیم و تربیت پر خرچ کر دیئے۔

فروخ: وہ عالم دین میرا ہی بیٹا ہے۔ سہیلہ! اللہ کی قسم! اُن تیس ہزار دیناروں کا اس سے بہتر استعمال ممکن نہ تھا۔ واللہ! تم نے وہ مال ضائع نہیں کیا۔ وہ اٹھا اور گھر سے باہر آ کر اپنے بیٹے کو تلاش کرنے لگا تا کہ اُسے اپنے سینے سے لگا کر تسکین حاصل کر سکے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت ہے کہ ربیعہ بن ابی عبد الرحمن فروخ اہل مدینہ منورہ کے فقہاء میں سے ہیں اور صحابہ کی ایک جماعت سے مل چکے ہیں، تابعین میں بہت بڑے امام الفقہ والحديث تھے، بڑے مجتہدین میں اُن کا شمار ہوتا ہے، اس لیے اُن کا لقب رائے پڑ گیا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ امام ربیعہ الرائے رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے ہیں۔

اس قصے کا ماخذ تاریخ بغداد، جلد ہشتم صفحہ 421، فضل الباری جلد دوم صفحہ 70 اور دائرة المعارف فرید و جدی جلد چہارم صفحہ 185 ہیں۔

حضرت عمر بن عبد العزیز

ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ رات کے وقت مدینہ کی گلیوں میں گشت کر رہے تھے۔ دورانِ گشت آپ کا آزاد کردہ غلام اسلم بھی ساتھ تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کچھ تھکن سی محسوس ہوئی تو ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ اندر سے عورتوں کی آوازیں آرہی تھیں:

ایک عورت کہہ رہی تھی:

اے لڑکی! اس دودھ میں پانی ملا دو۔

لڑکی بولی: مگر اماں! کیا آپ کو امیر المومنین کا حکم معلوم نہیں ہے کہ دودھ میں پانی نہ ملاؤ؟

عورت بولی: اے لڑکی! اس وقت تو امیر المومنین تجھے نہیں دیکھ رہا۔ اٹھ اور دودھ میں پانی ملا دے۔

لڑکی بولی: اماں! مجھ سے یہ منافقت نہیں ہوتی کہ میں خلیفہ کے سامنے تو سر تسلیم خم کروں اور انکی غیر موجودگی میں نافرمانی کروں۔ اگر اس وقت خلیفہ نہیں دیکھ رہے تو کیا ہوا، اللہ تو ہمیں دیکھ رہا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہایت خوش ہوئے کہ ابھی تو میرے حکم کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی اور رعایا نے عمل درآمد کرنا شروع کر دیا کیونکہ آج ہی تو آپ نے شکایتیں ملنے پر لوگوں کو دودھ میں پانی نہ ملانے کا حکم جاری کیا تھا۔ آپ نے اسلم سے کہا کہ اس گھر پر کوئی نشان لگا دو تاکہ پہچان سکو۔ آپ واپس گھر لوٹے تو آپ کے دل میں لڑکی کیلئے بڑا احترام تھا۔ صبح آپ نے اسلم کو اُس گھر کے مکینوں کی خبر لانے کو کہا۔ اسلم نے واپس آکر بتایا کہ اُس گھر میں ایک غریب عورت اور اُسکی کنواری بیٹی رہتے ہیں۔ آپ نے سوچا کہ کاش یہ نیک دل اور ایماندار لڑکی میری بیوی ہوتی مگر پھر آپ نے سوچا کہ میں تو اب بوڑھا ہو چکا ہوں یہ بے جوڑ شادی مناسب نہیں ہے۔ آپ نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ کیا کوئی اُس لڑکی سے شادی کرنا پسند کریگا؟ عاصم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بولے کہ میں تیار ہوں کیونکہ میری تو کوئی بیوی نہیں ہے۔

حضرت عاصم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رضامندی کا اظہار کیا تو آپ نے اُنکی شادی کروادی۔ حضرت عاصم کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی اور اُم عاصم کہلائیں۔ حضرت عمر بن عبد العزیز انہی کے بیٹے ہیں۔ اور حضرت عاصم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نواسے ہیں اس طرح آپ کا نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔ باپ کا نام مروان بن حکم ہے جو بنو اُمیہ کے پانچویں خلیفہ تھے اور اُس سے پہلے وہ مدینہ کے گورنر رہ چکے تھے۔ اُنکا دورِ خلافت ایک سال سے بھی کم ہے۔ بنو اُمیہ میں مروان کا کردار کوئی اچھا نہ تھا۔

ولید بن عبد الملک نے حضرت عمر بن عبد العزیز کو مدینہ کی گورنری کی پیشکش کی تو آپ نے اس شرط پر قبول کی کہ اپنے پیش رو حکمرانوں کے نقش

قدم پر نہیں چلیں گے اور نہ ہی عوام پر کسی قسم کا ظلم کریں گے۔ جب آپ واپس مدینہ پہنچے تو اکابرین اور فقہا کو بلا کر فرمایا:

"میں نے آپ لوگوں کو ایسے کام کیلئے بلایا ہے کہ جس کے کرنے سے آپ کو اجر و ثواب ملے گا۔ میں کوئی کام بھی آپ کی مشاورت اور معاونت کے بغیر نہیں کرنا چاہتا۔ آپ لوگ میرے حکومتی کارندوں کی جانب سے کہیں کوئی ظلم ہو تا دیکھیں تو مجھے بتائیں تاکہ میں معاملہ فہمی سے اُس معاملے کو سلجھا سکوں اور مظلوم کی داد رسی کر سکوں۔ اللہ تعالیٰ ضرور مجھے انصاف تک پہنچائے گا۔"

جب حضرت عمر بن عبد العزیز گورنر مدینہ بنے تو وہ ایک دو متمند خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کا ذاتی سامان ستر اونٹوں پر لاد کر مدینہ پہنچایا گیا۔ آپ 707ء سے 713ء عیسوی تک مدینہ کے گورنر رہے۔ آپ نے اپنی گورنری کے دور میں مسجد نبوی کی شاندار تعمیر کروائی۔ آپ نے عدل و انصاف کا بول بالا کر کے اہل حجاز کے دل جیت لئے۔ 713ء میں ولید بن عبد الملک نے آپ کو گورنر کے عہدے سے ہٹا دیا۔

سلیمان بن عبد الملک آپ کی شخصیت سے بیحد متاثر تھا۔ 718ء میں سلیمان بن عبد الملک وابق کے مقام پر اپنی فوج کی قیادت کر رہا تھا کہ اچانک بیمار ہو گیا۔ اُس نے اپنے وزیر رجاء بن حیوہ کو بلایا اور جانشینی کے بارے میں مشاورت کی۔ اپنی وصیت میں سلیمان بن عبد الملک نے حضرت عمر بن عبد العزیز کو اپنا پہلا جانشین اور یزید بن عبد الملک کو دوسرا جانشین مقرر کیا۔ سلیمان بن عبد الملک کی وفات کے بعد وصیت نامہ پڑھا گیا اور سب سے حضرت عمر بن عبد العزیز کی بیعت کیلئے کہا گیا۔ رجاء بن حیوہ کو ڈر تھا کہ کہیں بنو امیہ والے بیعت سے انکار نہ کر دیں۔ سب نے وصیت کی تعمیل کرتے ہوئے بیعت کر لی مگر سلیمان کے بھائی ہشام بن عبد الملک نے بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ رجاء بن حیوہ نے تلوار نیام سے باہر نکالی اور ہشام کو ڈانٹتے ہوئے بولا: ہشام اٹھو اور بیعت کرو، ورنہ میں تمہارا سر قلم کر دوں گا۔ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ہشام بن عبد الملک نے حضرت عمر بن عبد العزیز کی بیعت کر لی۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کو خلفاء راشدین میں پانچواں خلیفہ کہا جاتا ہے۔

خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا انصاف

بنو اُمیہ کا دورِ خلافت تھا جب ایران، عراق، اُردن، اُندلس، شام، مراکش، تیونس، الجزائر، مصر، طرابلس، فلسطین، یمن، نجد، حجاز، آرمینیا، سمرقند، آذربائیجان، خارا، کابل اور سندھ تمام مسلمانوں کے زیر تسلط تھے اور دمشق مسلمانوں کا دارالسلطنت تھا۔ یہ تمام علاقے صوبائی اکائیوں کے طور پر اس مُسلم سلطنت میں شامل تھے۔

جب امیر المومنین سلیمان کا انتقال ہوا تو اُس کے سپرد خاک ہونے کے فوراً بعد یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ ملک کے نئے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز ہونگے۔ عمر بن عبدالعزیز کا نسب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نواسوں سے ملتا ہے۔ نئے خلیفہ کے نام کا اعلان ہوتے ہی سرکاری پروٹوکول عمر بن عبدالعزیز کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ اس میں خادم اور خادماں، سونے اور جواہرات کے کام والی شاہی سواریاں اور مسلح سکیورٹی دستے شامل تھے۔ عمر بن عبدالعزیز نے حیران ہو کر پوچھا! یہ سب کیا ہے؟ منتظم نے جواب دیا کہ یہ سب امیر المومنین کا پروٹوکول ہے۔ آپ نے فرمایا، مجھے یہ سب نہیں چاہیے۔ سب کچھ واپس لے جاؤ اور مجھے میرا خنجر لادو۔ فوراً ہی خنجر پیش کر دیا گیا۔ جب آپ سوار ہو کر چلنے لگے تو ایک مسلح محافظ آپ کے آگے چلنے لگا۔ آپ نے فرمایا! پیچھے ہٹ جاؤ، مجھے ایک عام مسلمان ہی رہنے دو۔ شاہی جھنڈے والے خنجر پر سوار امیر المومنین سیدھے مسجد میں تشریف لے گئے۔ منبر پر کھڑے ہوئے تو فرمایا:

لوگو! میں اپنی مرضی کے بغیر سوئے گئے اس منصب سے دست بردار ہوتا ہوں، تم لوگوں کو اختیار ہے کہ جسے چاہیں اپنا خلیفہ منتخب کر لیں۔ تمام حاضرین بیک زبان ہو کر بولے کہ ہم آپ ہی کو اپنا خلیفہ بنانا چاہتے ہیں۔ آپ مسجد سے محل پہنچے تو حکم دیا کہ محل سے ریشمی پردے، قالین اور آرائش کا تمام سامان اُٹھا کر نیلام کر دیا جائے اور اس سے حاصل ہونے والی رقم بیت المال میں جمع کروادی جائے۔

لوگوں کا خیال تھا کہ یہ اللہ کا نیک بندہ ہے، امورِ سلطنت اس کے بس کا روگ نہیں۔ لیکن عمر بن عبدالعزیز نے ملکی امور کو قرآن و سنت کے مطابق چلاتے ہوئے ظالم و مظلوم اور امیر غریب کو بلا امتیاز عدالت کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا۔ آپ کے ماہرانہ انداز نے اپنے جدِ امجد حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یاد تازہ کر دی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی سلطنت میں سمرقند کا مفتوحہ علاقہ بھی شامل تھا۔ یہ فتوحات آپ کے دورِ خلافت میں ہوئی تھیں۔ جس لشکر نے یہ فتوحات حاصل کی تھیں، اُس کا سپہ سالار قتیبة بن مسلم تھا لیکن سمرقند کی فتح سے پہلے اُس کا انتقال ہو گیا، اس لئے باقی فتوحات اُسکے نائب سالاروں کے ہاتھوں انجام پائیں۔

سمرقند سے باہر جنگلوں اور پہاڑوں کے بیچ پروہتوں نے ایک مسکن بنایا ہوا تھا جو باہر سے ڈراؤنا اور ہیبت ناک لگتا تھا۔ پادریوں نے وہاں ایک بہادر

شخص کو اپنے مقصد کی تعمیل کیلئے بلوایا۔ وہ شخص وہاں پہنچا تو اُسے یہ مسکن بڑا پر اسرار لگا۔ وہ ابھی شش و پنج میں مبتلا کھڑا سوچ رہا تھا کہ اندر جاؤں یا انتظار کروں۔ اتنے میں بھاری بھر کم پتھر کی اوٹ سے ایک شخص نکلا اور اُسے ساتھ لیکر اندر چلا گیا۔ وہ اندر گیا تو اُسے بہت سے پادری بیٹھے نظر آئے۔ انہوں نے اُس شخص کو بتایا کہ تمہیں ہماری شکایت کا خط نہ صرف مسلمانوں کے خلیفہ وقت تک پہنچانا ہے بلکہ اسکا جواب بھی لے کر آنا ہے۔ سب باتیں سمجھا کر پیروہتوں نے اُسے زادِ راہ دیکر روانہ کیا۔

وہ شخص قلعہ نما پُر اسرار عمارت سے باہر آیا تو بید خوش تھا، کیونکہ اُسے بڑے پروہت نے آشیر باد دیکر دمشق بھیجا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کاش مجھے اسلامی لشکر سے ٹکرانے کا پروانہ ملتا لیکن یہ بھی کچھ برا نہیں کہ میرے دمشق جانے سے سمرقند آزاد ہو جائیگا۔ سمرقند سے دمشق تک مہینوں کا سفر تھا۔ دورانِ سفر وہ بخارا، بلخ، ہرات، قزوین، موصل اور حلب سے گذرا، سرسبز و شاداب زمینیں، پُر شکوہ عمارتیں اور محلات، پیچ و خم کھاتی ہوئی بڑی بڑی شاہرائیں، خوبصورت انسان، باپردہ حیا دار خواتین، دلکش پہاڑ، باغات اور میوؤں سے لدے درخت ایک سے بڑھ کر ایک عجائبات تھے۔ یہ سب دیکھ کر اُسے سمرقند کا حُسن اور عظمت معمولی نظر آنے لگے۔

دمشق پہنچا تو مسلمانوں کے دارالسلطنت کے جلال و جمال کو دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ عالیشان اور بلند و بالا عمارتیں دیکھ کر اُس کی عقل دنگ رہ گئی۔ یہاں پر مسلمانوں کا خلیفہ رہتا تھا کہ دمشق سے سمرقند تک اُس کا حکم چلتا تھا۔ اُمراء و حکمرانوں کی گردنیں جھک جاتی تھیں۔ رات ایک سرائے میں گزاری اور صبح ہوئی تو تیار ہو کر خلیفہ سے ملاقات کیلئے نکلا۔ اب اُسے گھبراہٹ ہونے لگی کہ اتنی بڑے سلطنت کے حکمران کا سامنا وہ کیونکر کر پائے گا۔ بلند و عالیشان عمارتوں کے سامنے سے گزرتا ہوا وہ سوچ رہا تھا کہ جب شہر کے حُسن کا یہ عالم ہے تو مسلمانوں کا خلیفہ کتنے خوبصورت محل میں رہتا ہو گا۔ چلتے چلتے وہ ایک حسین اور عالیشان عمارت کے سامنے پہنچا تو دیکھا کہ لوگ بلا روک ٹوک اس میں آ جا رہے ہیں۔ وہ بھی عمارت میں داخل ہو گیا۔ عمارت کے اندر کا حُسن دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ لمبے لمبے مرمریں ستون، نقش و نگار سے مزین دیواریں و سبج و عریض صحن کے وسط میں ایک جھیل، اور جھیل سے پھوٹے ہوئے پھوارے دیکھ کر اُسے لگا کہ وہ کسی اور ہی دنیا میں آ گیا ہے۔ کہیں درس و تدریس ہو رہی ہے تو کہیں علمی حلقے قائم ہیں۔ کہیں فتوے لکھے جا رہے ہیں تو کہیں پر عدالتی فیصلے سنائے جا رہے ہیں۔ وہ چلتے چلتے ایک شخص کے پاس پہنچا جو نماز ادا کر رہا تھا۔ اُس نے نماز مکمل کر کے اجنبی کا حال دریافت کیا۔ تو اجنبی نے بتایا کہ وہ خلیفہ سے ملنا چاہتا ہے۔

نمازی نے کہا: کیا تم امیر المومنین کے گھر کا پتہ پوچھ رہے ہو؟

سمرقندی شخص نے کہا: کیا یہ امیر المومنین کا گھر نہیں ہے۔

نمازی ہنستے ہوئے بولا: نہیں دوست یہ اللہ کا گھر ہے۔ کیا تم نے نماز پڑھ لی ہے؟

سمرقندی نوجوان کو تو دیوتاؤں کی ڈراؤنی صورتوں اور مندروں کے اندھیرے ماحول کے علاوہ کچھ معلوم نہ تھا۔

وہ بولا: میں نے نماز نہیں پڑھی، کیونکہ مجھے نہیں معلوم کہ نماز کیسے ادا کی جاتی ہے۔ میں تو سمرقند والوں کے دین کا پجاری ہوں اور مقدس مورتیوں کی پوجا کرتا ہوں۔

نمازی نے اجنبی سے پوچھا: تمہارا رب کون ہے؟

اجنبی بولا: مندر کے دیوتا ہی میرے خدا ہیں۔

نمازی نے پوچھا کہ کیا تمہارے دیوتا تمہیں بیماری سے شفا دیتے ہیں اور تمہاری حاجتیں پوری کرتے ہیں؟

اجنبی نے کہا: مجھے کچھ معلوم نہیں۔

نمازی نے اجنبی کو اسلام کے بارے میں بتایا۔ اجنبی جو پہلے ہی مسلمانوں کی شان و شوکت سے مرعوب ہو چکا تھا۔ اسلام کا پیروکار بن گیا۔

نمازی نے کہا کہ میرے ساتھ چلو میں تمہیں امیر المومنین کا گھر دکھاتا ہوں۔ وہ اجنبی کو لیکر دوسرے دروازے سے باہر نکلا اور ایک لکڑی کے دروازے والے تنگ سے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ یہ امیر المومنین کا گھر ہے۔

اجنبی نے دیکھا کہ دروازے کی اوٹ میں ایک بزرگ دیوار کی مرمت کر رہا ہے اور ایک بوڑھی عورت بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھی۔ وہ فوراً پلٹا اور نمازی کو جا پکڑا۔ تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا، وہ تو کسی معمار کا گھر ہے۔ پھر اُس نے بوڑھے آدمی کا حلیہ بتایا تو نمازی بولا:

ارے بھائی! وہی تو امیر المومنین ہیں اور وہ عورت خلیفہ عبد الملک کی بیٹی اور ولید بن عبد الملک اور سلیمان کی بہن ہے۔ امیر المومنین عمر بن عبد العزیز ایک مالدار اور خوش پوش انسان تھے۔ چونکہ اُن کا نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے اس لئے رگِ عدل انہیں اس حالت میں لے آئی۔ تم بے خوف ہو کر انکے پاس جاؤ اور اپنا مقصد بیان کرو۔ وہ منکسر المزاج امیر المومنین ہیں اور تمہیں ضرور انصاف دیں گے۔

اجنبی نے پھر نمازی سے پوچھا۔

بھائی! تم سچ کہہ رہے ہو، کیا واقعی یہی شخص امیر المومنین ہے۔

نمازی نے کہا! میرے بھائی تم جا کر ملو تو سہی، خود ہی جان جاؤ گے۔

اجنبی نے ڈرتے ہوئے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی ہی دیر میں امیر المومنین باہر آئے تو سمرقندی اجنبی نے اسلامی جرنیل قتیبہ بن مسلم کی افواج

کی شکایت کی:

امیر المومنین! اسلامی فوج کے جرنیل نے نہ تو ہمیں دعوتِ اسلام دی اور نہ ہی جزیہ طلب کیا۔ اُس نے بغیر اعلانِ جنگ کئے سمرقند پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔

امیر المومنین نے فرمایا! ہمارے نبی کریم ﷺ نے ظلم سے منع فرمایا ہے۔ اور مُسلم یا غیر مُسلم کی تمیز کئے بغیر انصاف کا حکم فرمایا ہے۔ یہ کہہ کر امیر المومنین نے غلام سے کاغذ اور قلم طلب فرمایا اور حکم نامہ لکھ کر مہرِ خلافت لگائی اور خطِ اجنبی کے سپرد کرتے ہوئے فرمایا: یہ خط سمرقند کے گورنر کے پاس لے جاؤ۔

اجنبی خط لیکر منزلیں طے کرتا ہوا واپس جا رہا تھا۔ جب کسی شہر میں پہنچتا تو سیدھا مسجد میں جاتا۔ مسجد میں قیام کے دوران وہ مسلمانوں کیساتھ نماز ادا کرتا تو اُسے عجیب سا سکون محسوس ہوتا۔ سامنے کوئی بت نہ مجسمہ اور نہ کوئی پروہت، امیر و غریب حاکم و محکوم گورے اور کالے سب ایک ہی صف میں کھڑے امام کی اقتدا میں اپنے رب کے سامنے رکوع و سجود کر رہے ہیں۔ مسجد میں مسافر سمجھ کر لوگ مہمانوں جیسا سلوک کرتے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب میں منزل کی جانب جا رہا تھا تو ہر شخص اجنبی سا لگتا تھا اور اب جب وہ واپس لوٹ رہا ہے تو ہر کسی سے مل کر اپنا ہیبت سی محسوس رہی تھی۔

سمرقند پہنچتے ہی وہ سیدھا مندر پہنچا اور دروازے پر دستک دی۔ مندر کا دروازہ کھلا تو وہ اندر چلا گیا۔ وہاں موجود پروہت اور پجاری سب اُسے زندہ سلامت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ خود بھی حیران ہو رہا تھا کہ اب اُسے ڈراؤنے مجسموں اور پروہتوں کو دیکھ کر کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اُس نے اپنے سفر کی حیران کن روداد انہیں سنائی۔ مگر اپنے اسلام قبول کرنے کو مخفی رکھا اور گورنر کے نام خط اُن کے حوالے کر دیا۔

پروہتوں نے خط فوراً گورنر تک پہنچایا۔ گورنر نے خط پڑھا اور امیر المومنین کے حکم کے مطابق خصوصی عدالت تشکیل دی اور جمیع بن حاضرباجی کو قاضی مقرر کیا۔ مقررہ تاریخ کو فریقین مسجد میں جمع ہوئے اور قاضی کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد ایک دبلا پتلا سا بوڑھا سر پر ٹوپی رکھے مسجد میں داخل ہوا۔ اُس کے ساتھ ایک غلام تھا۔ قاضی نے دو نفل ادا کئے اور مسجد کے ستون کیساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ قاضی کو دیکھ کر پروہتوں کی اُمید دم توڑ گئی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ یہ نحیف سا بوڑھا اسلامی فوج کیخلاف ہمارے حق میں کیونکر فیصلہ سنائے گا۔

قاضی کے غلام نے اسلامی فوج کے جرنیل کو بغیر لقب کے پکارا تو وہ دائیں جانب آکر بیٹھ گیا۔ غلام نے پروہتوں کے سربراہ کو بلایا اور وہ آکر بائیں جانب بیٹھ گیا۔ مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی تو قاضی نے پروہتوں کے سربراہ سے کہا کہ وہ اپنا دعویٰ پیش کریں۔

پروہت نے بتایا کہ اسلامی لشکر کے سپہ سالار نے نہ تو ہمیں دعوتِ اسلام دی اور نہ ہی جزیہ طلب کیا، بلکہ بغیر اعلانِ جنگ کئے دھوکے سے حملہ کر کے ہمارے ملک پر قبضہ کر لیا۔

قاضی نے جرنیل کو جوابِ دعویٰ کیلئے کہا۔ جرنیل نے کہا کہ اللہ حق و انصاف کا بول بالا رکھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ذریعے اس ملک سے کفر کی جہالت

ختم کر کے اسلام کا بول بالا کیا اور مسلمانوں کو یہاں کا حکمران بنایا۔

قاضی نے پوچھا: کیا تم نے انہیں اسلام کی دعوت دی تھی اور ان کے انکار پر ان سے جزیہ طلب کیا تھا؟ اور پھر کیا تم نے اعلانِ جنگ کیا تھا؟
جرنیل نے جواب دیا: میں نے ایسا نہیں کیا تھا۔

قاضی نے کہا: تو گویا تمہیں اپنی غلطی کا اقرار ہے۔ یاد رکھو! اللہ کے دین کی فتح اس کے حق و انصاف کی وجہ سے ہے اور اللہ نے یہ اجازت بالکل نہیں دی کہ ہم حق و انصاف کے بغیر ملکوں پر قبضہ کرتے جائیں۔ یہ فیصلہ سنایا جاتا ہے کہ مسلمان اس ملک کی حدود سے نکل جائیں اور پھر سرحد پر سے اسلامی دستور کے مطابق دعوتِ اسلام پیش کریں۔ انکار کی صورت میں ان سے جزیہ طلب کریں۔ اگر پھر بھی انکار کریں تو اعلانِ جنگ کریں تین روز تک ان کے فیصلے کا انتظار کریں۔ فیصلہ سناتے ہی قاضی نے عدالت پر درخواست کر دی۔

اور چند گھنٹوں کے بعد ہی سمرقندیوں نے اپنے پیچھے گرد و غبار کے بادل چھوڑتے لوگوں کے قافلے دیکھے جو شہر کو ویران کر کے جا رہے تھے۔ لوگ حیرت سے ایک دوسرے سے سبب پوچھ رہے تھے اور جاننے والے بتا رہے تھے کہ عدالت کے فیصلے کی تعمیل ہو رہی تھی۔

اور اُس دن جب سورج ڈوبا تو سمرقند کی ویران اور خالی گلیوں میں صرف آوارہ کتے گھوم رہے تھے اور سمرقندیوں کے گھروں سے آہ و پکار اور رونے دھونے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، اُن کو ایسے لوگ چھوڑ کر جا رہے تھے جن کے اخلاق، معاشرت، برتاؤ، معاملات اور پیار و محبت نے اُن کو اور اُن کے رہن سہن کو مہذب بنادیا تھا۔

اور یہ سب کیوں نہ ہوتا، کہیں بھی تو ایسا نہیں ہوا تھا کہ فاتح لشکر اپنے ہی قاضی کی کبی دوباتوں پر عمل کرے اور شہر کو خالی کر دے۔ دینِ رحمت نے وہاں ایسے نقوش چھوڑے کہ سمرقند ایک عرصہ تک مسلمانوں کا دار الخلافہ بنا رہا۔

پروہت حیران تھے کہ یہ کیسی عدالت ہے جس نے فریقین کو سن کر چند لمحوں میں فیصلہ سنایا، نہ کوئی گواہی اور نہ ہی کوئی دلیل۔ اور مسلمانوں کا سپہ سالار جو مدینہ سے نکلا تو سمرقند تک کوئی اُس کی راہ نہ روک سکا۔ مگر جب قاضی نے فیصلہ سنایا تو وہ اُسے قبول کر کے چلا گیا۔ بڑا پروہت سوچ رہا تھا کہ اب اسلامی لشکر سرحدوں پر جا کر اپنے دستور کے مطابق ہمیں دعوتِ اسلام دیگا، انکار کی صورت میں ہم سے جزیہ طلب کرے گا۔ پھر جزیہ سے انکار کی صورت میں وہ ہم سے اعلانِ جنگ کریگا۔ جب مسلمان سمرقند پر لشکر کشی کریں گے تو کیا سمرقند والے اس لشکر کا مقابلہ کر سکیں گے جسے چین، روم اور ایران کی افواج نہ روک سکیں تو کیا اب سمرقند والے اس طوفانی لشکر کا مقابلہ کر سکیں گے؟ نہیں ہر گز نہیں۔ یہ سوچ بڑے پروہت نے اپنے ساتھیوں کے سامنے بیان کی اور پوچھا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

پیغامِ رساں سمرقندی نے کہا۔ اب ہمیں بھی انصاف کا یہ مذہب اختیار کر لینا چاہیے اس لئے کہو! أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ

بڑا پروہت جس کا دل قاضی کا فیصلہ سن کر بدل چکا تھا، پکار اٹھا! اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ

بڑے پروہت سے کلمہء شہادت سن کر سارا سمرقند نعرہ تکبیر سے گونج اٹھا۔

تاریخ گواہ ہے کہ سمرقندی یہ فراق چند گھنٹے بھی برداشت نہ کر پائے، اپنے پرہتوں کی قیادت میں ”لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ“ کا اقرار کرتے مسلمانوں کے لشکر کے پیچھے روانہ ہو گئے اور اُن کو واپس لے آئے۔

امیر المومنین حضرت عُمر بن عبدالعزیز اُموی دور کے آٹھویں خلیفہ تھے۔ آپ کو خلفائے راشدین کے سلسلہ کے پانچویں خلیفہ بھی کہا جاتا ہے۔ اُن کے عدل و انصاف سے مشرق و مغرب کے ممالک دین اسلام سے بہرہ ور ہو کر دائرہ اسلام میں شامل ہوئے۔ متقی اتنے تھے کہ جو نہی سرکاری کام ختم ہوتا، سرکاری چراغ بجھا کر اپنے گھر کا چراغ روشن کر لیتے تھے۔ گھر میں کوئی ملازم نہیں تھا۔ حضرت عُمر بن عبدالعزیز اور اُنکی بیوی اپنے گھر کے کام خود کرتے تھے۔

یہ واقعہ شیخ علی طنطاوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”قصص من التاریخ“ سے لیا گیا ہے جو مصر میں 1932 میں چھپی تھی۔

خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی سادگی

حضرت عمر بن عبدالعزیز جب خلیفہ مقرر ہوئے تو انہوں نے بنو امیہ کے محلات اور آسائشوں کو ٹھکرا کر ایک عام سے مکان میں رہنے کو ترجیح دی۔ آپ کے گھر میں کوئی سرکاری نوکر نہیں تھا۔ گھر کے کام آپ خود یا پھر آپ کی بیوی کرتی تھیں۔ آپ نے خلیفہ مقرر ہوتے ہی اپنی بیوی فاطمہ سے کہا کہ سب زرو جواہرات جو تمہارے باپ عبدالملک نے تمہیں دیئے ہیں وہ بیت المال میں جمع کروادو یا پھر تمہیں علیحدگی کا اختیار ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی بیوی فاطمہ خلیفہ عبدالملک کی بیٹی اور ولید، سلیمان، یزید اور ہشام کی بہن تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہر کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اپنا سب مال و زر بیت المال بھجوا دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے خلیفہ مقرر ہوتے ہی بنو امیہ کے سابقہ ادوار میں عوام کی غصب کی ہوئی تمام جائیدادیں انکے اصل وراثہ کے حوالے کر دیں۔

سادگی کا یہ عالم تھا کہ آپ کے پاس کپڑوں کا صرف ایک ہی جوڑا تھا۔ جب وہ میلا ہو جاتا تو اُسے دھو کر دوبارہ پہن لیتے تھے۔ جب آپ بستر مرگ پر تھے تو آپ کے برادرِ نسبتی نے اپنی بہن فاطمہ سے کہا: لوگ امیر المومنین کی عیادت کیلئے آرہے ہیں۔ تم اُن کے کپڑے بدلوا دو کیونکہ وہ میلے ہو رہے ہیں۔ خلیفہ بننے سے پہلے آپ اتنے نفاست پسند تھے کہ دن میں کئی مرتبہ اپنے قیمتی لباس بدلتے کہ ملنے والے کو پسینے کی بدبو نہ آئے۔

بھائی کی بات سُن کر فاطمہ خاموش رہیں، مگر بھائی نے پھر تقاضا کیا تو فاطمہ بولیں: بھائی! خدا کی قسم! خلیفہ اسلام کے پاس دوسرا کوئی کپڑا نہیں ہے۔ میں انہیں پہنانے کیلئے کہاں سے کپڑے لاؤں؟ جو کپڑے اُس وقت خلیفہ وقت کا بدن ڈھانپے ہوئے تھے اُن میں جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے تھے۔

بیت المال سے بمشکل قدرِ ضرورت روزمرہ کا سامان لیتے تھے۔ ایک دن انگور کھانے کی خواہش ہوئی تو اپنی بیوی سے فرمایا: آج انگور کھانے کی خواہش ہو رہی ہے کیا تمہارے پاس ایک درہم ہے کہ میں یہ خواہش پوری کر سکوں؟

آپ کی بیوی فاطمہ بولیں: کیا امیر المومنین اتنا بھی اختیار نہیں رکھتے کہ چھوٹی سی خواہش کو پورا کر سکیں؟

آپ نے فرمایا: فاطمہ! میرے لئے جہنم کی ہتھکڑی سے آسان ہے کہ اپنی خواہش کو دبالوں۔

ایک روز عراق سے ایک عورت آپ سے ملنے آئی۔ دروازے پر پہنچ کر اُس نے لوگوں سے پوچھا۔ کیا امیر المومنین کا کوئی دربان ہے کہ جس سے اجازت لیکر میں اُنہیں مل سکوں؟ لوگوں نے کہا: امیر المومنین کے دروازے پر کوئی دربان نہیں ہے، آپ اندر جاسکتی ہیں۔ وہ عورت اندر گئی تو فاطمہ روئی کات (روئی سے دھاگا بنانا) رہی تھیں۔ عورت سلام کر کے اُن کے پاس بیٹھ گئی۔ ادھر ادھر نظر دوڑا کر دیکھا کہ گھر میں کوئی قیمتی چیز نہیں ہے۔

عورت نے فاطمہ سے کہا: میں تو اس لئے آئی تھی کہ خلیفہ سے اپنا گھر آباد کرنے کیلئے کچھ مدد طلب کروں مگر اب سوچتی ہوں کہ میں اُن سے کیا مانگوں

کہ جن کا اپنا گھر ہی بے آباد ہے؟

فاطمہ ایک سلیقہ مند خاتون تھیں۔ خلیفہ کی پوتی، خلیفہ کی بیٹی، چار خلفاء کی بہن اور اب خلیفہ وقت کی بیوی تھیں۔ اُس عورت سے بولیں: امیر المؤمنین نے تم جیسے لوگوں کے گھروں کو آباد کرنے کیلئے ہی تو اس گھر کو بے آباد کیا ہے۔

ابھی عورت فاطمہ سے باتیں کر رہی تھی کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز گھر تشریف لے آئے۔ عورت نے بتایا کہ میں پانچ بچیوں کی ماں ہوں مگر غربت و ناداری کی وجہ سے نہ تو انکے پیٹ پال سکتی ہوں اور نہ ہی انکی شادیاں کرنے کی مجھ میں سکت ہے۔ آپ میری کچھ مدد فرمائیں۔ آپ نے کاغذ قلم منگو کر حاکم عراق کے نام خط لکھنا شروع کیا۔ ہر بچی کا نام پوچھ کر آپ وظیفہ مقرر کرتے رہے اور عورت اللہ کا شکر ادا کرتی رہی۔ جب آپ چار بچیوں کا وظیفہ مقرر کر چکے تو عورت خوشی سے بے قابو ہو کر آپ کا شکریہ ادا کرنے لگی اور دُعائیں دینے لگی۔ آپ نے خط لکھنا بند کر دیا اور اُس عورت کے سپرد کیا کہ وہ عراق کے حاکم کو دیدے۔

پھر آپ نے فرمایا: جب تک تو اس کا شکر ادا کرتی رہی جو اس کا اہل ہے تو تیرے گھر کے رزق میں اضافہ ہو تا رہا اور اب تو اس کا شکر ادا کر رہی ہے جس کا اپنا دامن خالی ہے۔ میں تو تجھے کچھ نہیں دے سکتا۔ اب تو پانچویں بچی کیلئے اسی رزق میں سے حصہ نکال۔ وہ عورت خط لیکر عراق واپس لوٹ گئی۔

شکرانہِ نعمت ادا کرو

مسندِ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے:

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ریشم کی تجارت کرتے تھے۔ آپ محدثین و مشائخ سے رقم لیکر بغداد سے سامانِ تجارت خریدتے اور کوفہ میں لا کر فروخت کر دیتے۔ اس تجارت سے جو منافع حاصل ہوتا، آپ اُس سے اُن کی ضروریات کو پورا کرتے تھے اور پھر سال بھر بعد باقی ماندہ منافع کی رقم اُن میں تقسیم فرما دیتے اور کہتے کہ اس رقم سے تم اپنی باقی ضروریات کو پورا کرو اور اللہ کا شکر ادا کرو۔ میرا شکر ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تمہاری رقم سے خریدے گئے مال کا منافع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کا ذریعہ بنا دیا ہے وگرنہ یہ سب تو اللہ ہی کا کرم ہے۔

حسن بن زیاد بیان کرتے ہیں:

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ایک دن مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے تو آپ نے مجلس میں ایک خستہ لباس شخص کو دیکھا۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو آپ نے اُس شخص کو رُکنے کیلئے کہا۔ جب سب لوگ چلے گئے تو آپ نے اپنے جائے نماز کا کونہ اٹھایا اور فرمایا: جو اس کے نیچے پڑا ہے وہ تم لے لو۔ اُس شخص نے جب جائے نماز کے نیچے سے ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو اُس کے ہاتھ میں ایک ہزار درہم تھے۔ اُس نے رقم ہاتھ میں اٹھائے معنی خیز نظروں سے آپ کی جانب دیکھا تو آپ نے فرمایا: اے شخص! تم یہ رقم رکھ لو اور اپنے لئے اچھا سا لباس خرید لینا اور اپنا خلیہ درست کر لینا۔ وہ شخص رقم لوٹاتے ہوئے بولا: حضرت! میں ایک صاحبِ حیثیت آدمی ہوں مجھے اس رقم کی ضرورت نہیں ہے۔

آپ نے فرمایا: پھر جاؤ اور اپنا خلیہ ایسا بناؤ کہ جسے دیکھ کر تمہارے بھائی کو غم نہ ہو۔ کیا تمہیں یہ حدیث معلوم نہیں ہے کہ "اللہ اپنے بندوں پر اپنے نعمت و کرم کے آثار دیکھنا پسند کرتا ہے۔"

معزز قارئین! اللہ کی عنایتوں کا شکر ادا کرو۔ اللہ نے عطا فرمایا ہے تو خوش لباس رہو۔ اپنی اولاد، اپنے بہن بھائیوں، رشتہ داروں، محلہ داروں، شہر والوں، ملک والوں اور پھر دنیا میں موجود اپنے مسلمان بہن بھائیوں کی ہر ممکن مدد کرو۔ اللہ کا فرمان ہے کہ میں اپنے بندوں کو مال و اولاد دیکر اور نہ دیکر آزماتا ہوں۔ جو اللہ کے بندے ہوتے ہیں وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اور یہی لوگ آخرت میں اللہ کا انعام پانے والے ہیں۔

أَهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ﴿الفاتحہ-6﴾ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ﴿الفاتحہ-7﴾

اے اللہ! ہمیں سیدھے رستے پر چلا۔ اُن لوگوں کو لوگوں کے رستے پر کہ جو تیرے انعام کے حقدار ٹھہرے نہ کہ ان لوگوں کے، کہ جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ ہی گمراہوں کے۔ آمین

اللہ پر توکل

سلمیٰ بن دینار مشہور عالم اور صوفی تھے اور قبیلہ بن تمیم سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے سلمیٰ بن دینار المدنی کے نام سے شہرت پائی۔ اپنے آپ کو اسلام کیلئے وقف کر دیا تھا۔ آپ کے بیٹے سیدنا حماد بن سلمیٰ ایک مشہور عالم و محدث گذرے ہیں۔ اُن کا شمار بصرہ کے مُقتیان میں ہوتا ہے۔ علمِ حدیث پر عبور رکھتے تھے اور تبلیغِ اسلام میں اُن کا کردار نہایت اہم ہے۔ سیدنا حماد بن سلمیٰ 82 ہجری میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔

سردیوں کا موسم تھا اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور رُکنے کے کوئی آثار نہ تھے۔ بارش کے تسلسل سے سردی بڑھنے لگی اور لوگوں میں پریشانی بڑھنے لگی۔ میرے پڑوس میں ایک بیوہ خاتون اپنی یتیم بچیوں کے ساتھ بوسیدہ سے مکان میں رہتی تھی اور میرا مکان اُس کے مکان کیساتھ ہی تھا۔ یہ خاتون بڑی نیکدل اور عبادت گزار تھی۔ نیکدل خاتون کے گھر میں ایک ہی کمرہ تھا۔ بارش سے کمرے کی چھت ٹپکنے لگی اور پھر اچانک گلی کا پانی جمع ہو کر گھر میں داخل ہونے لگا۔ نیکدل خاتون کے بچے چار پائی پر بیٹھے سردی سے ٹھٹھہ رہے تھے۔ خاتون سے بچوں کی یہ حالت دیکھی نہ گئی اور اُس نے اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگی:

اے میرے پروردگار! بیشک تو رحیم و کریم ہے اور میں تجھ سے رحم اور نرمی کی دُعا مانگتی ہوں، تو ہمارے حال پر رحم فرما۔

جب نیکدل خاتون دُعا مانگ رہی تھی تو اُس کی آواز میرے کانوں تک آرہی تھی۔ میں نے عجیب معجزہ دیکھا کہ جو نہی نیکدل خاتون کی دُعا ختم ہوئی، بارش رُک گئی۔ معجزہ دیکھ کر میرے دل میں اُس خاتون کیلئے عزت و تکریم اور بھی بڑھ گئی۔ میں اُٹھا اور دس سونے کی اشرفیاں لیکر تھیلی میں ڈالیں اور اُس کے دروازے پر پہنچ کر دستک دی۔

دستک دیکر میں جواب کے انتظار میں دروازے کے باہر رُک گیا۔ اندر سے خاتون کی آواز سنائی دی۔ اللہ کرے کہ آنیوالا حماد بن سلمیٰ ہو؟ خاتون چلتی ہوئی دروازے تک آئی اور پوچھا: اے دستک دینے والے تم کون ہو؟

میں نے جواب دیا: اے نیکدل خاتون میں حماد بن سلمیٰ ہوں۔

خاتون نے دروازہ کھولا اور بولی: کہو بھائی کیسے آنا ہوا؟ میں نے جواب دیا: اے نیکدل خاتون! جب آپ دُعا مانگ رہی تھیں تو اتفاق سے میں دیوار کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ میں نے سنا کہ آپ کہہ رہی تھیں "اے میرے پروردگار! بیشک تو رحیم و کریم ہے اور میں تجھ سے رحم اور نرمی کی دُعا مانگتی ہوں، تو ہمارے حال پر رحم فرما" میں یہ جاننے کیلئے حاضر ہوا ہوں کہ کیا آپ کی یہ دُعا اللہ کے ہاں مقبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کیساتھ کیا نرمی کا معاملہ فرمایا ہے؟

وہ خاتون بولی: ہاں میرے بھائی! اللہ نے ہم پر یہ نرمی فرمائی کہ بارش رُک گئی۔ میرے گھر کی چھت ٹپکنا بند ہو گئی اور میرے گھر میں جو پانی جمع ہو چکا تھا

وہ بھی خُشک ہو گیا۔ میرے بچے سردی سے محفوظ ہو گئے اور پھر انہوں نے گھر کو گرم کرنے کا بھی انتظام کر لیا۔

میں نیکدل خاتون کی باتیں سُن کر بہت متعجب ہوا اور نہایت عاجزی سے اشرفیوں کی تھیلی اُسے دیتے ہوئے کہا: یہ کچھ رقم ہے جو میں آپ کی نذر کرتا ہوں آپ اسے اپنی گھریلو ضروریات کیلئے استعمال کر سکتی ہیں۔ خاتون کی ایک بیٹی پیچھے کھڑی ہماری باتیں سُن رہی تھی، وہ اچانک چل کر میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔ لڑکی نے اون کا پھٹا پرانا سا کرتا پہنا ہوا تھا جس پر کئی جگہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ وہ بولی: میرے مُحترم حماد بن سلمیٰ! کیا آپ دُنیا کی یہ دولت دیکر ہمارے اور ہمارے اللہ کے درمیان پرہ حال کرنا چاہتے ہیں؟ ہمیں ایسی دولت نہیں چاہیے کہ جو ہماری فریاد ہمارے رب پہنچنے میں کوئی رکاوٹ ڈالے۔

پھر وہ لڑکی اپنی ماں سے بولی: امی جان! جب ہم نے مصیبت میں اپنے رب کو پکارا تو اُس نے ہماری التجا سُنی۔ اُس نے نہ صرف ہماری تکلیف دور فرمائی بلکہ دُنیاوی دولت بھی بھجوا دی۔ ایسا نہ ہو کہ ہم دُنیاوی دولت کے سبب اللہ کے ذکر سے غافل ہو جائیں اور ہماری امیدوں کا محور ہمارے رب کے سوا کوئی اور ہو۔

پھر وہ لڑکی اپنا چہرہ زمین پر مسلتے ہوئے کہنے لگی: اے میرے پروردگار! ہمیں تیری عزت و جلال کی قسم! ہمیں یہ گوارہ نہیں کہ تیرے در کے سوا کسی اور سے اُمیدیں لگائیں۔ ہمیں تیری قسم! ہم تیرے در پر ہی پڑے رہیں گے، اگر تو نے ہمیں دھتکار بھی دیا تو بھی ہم تیرے در کو نہیں چھوڑیں گے۔ پھر وہ لڑکی میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہنے لگی: مُحترم حماد بن سلمیٰ! اللہ آپ کا نگہبان ہو، مہربانی فرما کر آپ یہ رقم واپس لے جائیں، ہمیں یہ دُنیاوی دولت نہیں چاہیے۔ ہمیں تو ہمارا پروردگار ہی کافی ہے۔ وہ ہمیں کبھی مایوس نہیں کریگا۔ ہم اپنی تمام حاجتیں اپنے رب سے بیان کرتے ہیں اور وہ ہماری حاجت روائی کرنے والا ہے۔ وہ تو ساری مخلوق حاکم اور تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔

اِس بے سہارا بیوہ خاتون اور اُس بیٹی کے اللہ پر اعتقاد نے میری ہمدردی کے جذبے کو شرمندہ کر دیا اور میں سر جھکائے اپنے گھر واپس لوٹ آیا۔

حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ اور بچے کی دلیل

عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے دور میں ایک بزرگ حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ ایک روز وہ گلی سے گزر رہے تھے۔ وہاں کچھ بچے اخروٹوں سے کھیل رہے تھے اور پاس ہی ایک بچہ کھڑا رو رہا تھا۔ حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ سمجھے کہ شاید اس کے پاس اخروٹ نہیں ہیں اور وہ کھیل نہ سکنے کی وجہ سے رو رہا ہے۔

آپ اُس بچے کے قریب گئے اور بولے: بیٹا رومت! میں ابھی تمہیں اخروٹ لے کر دیتا ہوں اور پھر تو بھی ان کے ساتھ کھیل میں شریک ہو جانا۔ بچہ روتے روتے خاموش ہو گیا اور بولا: بہلول بابا! کیا ہم دنیا میں کھیلنے کیلئے آئے ہیں؟

حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ کو بچے سے ایسے جواب کی توقع نہ تھی۔ انہوں نے پیار سے پوچھا: بیٹا! تم بتاؤ کہ ہم پھر کیا کرنے آئے ہیں؟ بچہ بولا: ہم دنیا میں اللہ کی عبادت کرنے کیلئے آئے ہیں۔

حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ بولے: بیٹا! ابھی تو تم کم عمر ہو، تم اس کا غم مت کرو۔ ابھی تو تمہارے پاس اس منزل پر پہنچنے کیلئے بہت وقت پڑا ہے۔ بچہ بولا: بہلول بابا! کیا تمہیں یقین ہے کہ میں اُس عمر تک پہنچ بھی پاؤں گا؟

حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ بولے: بیٹا! یہ تو کوئی بھی نہیں جانتا کہ کس نے کتنی دیر اس دنیا میں رہنا ہے؟ بچہ بولا: تو میں پھر کیوں اپنا وقت کھیل کود میں ضائع کروں؟

حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ بولے: بیٹا! تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟

بچہ بولا: بہلول بابا! میں اپنی ماں کو دیکھتا ہوں کہ وہ ہر روز آگ جلانے کیلئے پہلے چھوٹی لکڑیوں کو جلاتی ہے۔ جب وہ اچھی طرح جلنے لگتی ہیں تو پھر ان کے اوپر بڑی لکڑیاں ڈال دیتی ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں دوزخ کی آگ جلانے کیلئے بھی پہلے مجھے نہ ڈالا جائے اور پھر میرے اوپر بڑوں کو ڈالا جائے؟ بچے کی بات سن کر حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ کے ہوش جاتے رہے اور وہ بیہوش ہو کر گر گئے۔

خلیفہ ہارون الرشید کا متقی بیٹا

ہارون الرشید سلطنتِ عباسیہ کے پانچویں خلیفہ تھے۔ ان کا شمار نیک دل بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ نماز و روزے کا پابند وہ ایک باعمل مسلمان تھا۔ دل کھول کر صدقہ و خیرات دیتا تھا۔ ہارون الرشید کا ایک سولہ سال کا بیٹا تھا جو بڑا متقی اور پرہیزگار تھا۔

ہارون الرشید جب خلیفہ بنا تو شاہی محل میں آگیا۔ شاہی محل میں پُر تعیش کمرے اور خواب گاہیں تھیں جن میں قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے اور کھڑکیوں اور دروازوں پر بے انتہا قیمتی پردے پڑے ہوئے تھے۔ شاہی محل میں خلیفہ کے ہزاروں خدمتکار، خادماں اور نوکر چاکر تھے۔ بیٹے کو باپ کے شاہانہ انداز پسند نہ تھے۔ وہ اکثر متقی اور زاہدین کی مجالس میں بیٹھا رہتا یا پھر قبرستان چلا جاتا اور وہاں اثریہ شعر پڑھا کرتا:

تزعنی الجنانز کل یوم ویحزننی بکاء النائحات

مجھے جنازے ہر روز ڈراتے ہیں اور مرنے والوں پر رونے والیوں کی آوازیں مجھے غمگین کر دیتی ہیں۔

خلیفہ ہارون الرشید ایک دربار میں بیٹھا تھا۔ مجلس میں اراکینِ سلطنت، وزیر اور اُمراء موجود تھے کہ

اُس کا بیٹا مجلس میں آگیا۔ اہل مجلس نے دیکھا کہ وہ معمولی سے کپڑے پہنے سر پر لنگی لپیٹے ہوئے تھا۔ وہ آپس میں کہنے لگے کہ اس لڑکے کی حرکتوں نے امیر المومنین کو دوسرے بادشاہوں کی نظروں میں ذلیل کر دیا ہے۔ خلیفہ ہارون الرشید اہل مجلس کی باتیں سن کر شرمندہ ہو گیا مگر زبان سے کچھ نہ بولا۔

خلیفہ ہارون الرشید جب مجلس سے فارغ ہو کر محل میں آیا تو اپنی بیوی ممتاز بیگم کے پاس آیا۔ اتفاق سے بیٹا بھی وہیں موجود تھا۔ خلیفہ ہارون الرشید نے اپنی بیوی ممتاز بیگم سے کہا کہ تمہارے بیٹے کی حرکتوں سے میں دربار میں شرمسار ہو جاتا ہوں۔ اس سے کہو کہ دربارِ شاہی کے آداب کو مد نظر رکھتے ہوئے اچھے لباس میں وہاں آیا کرے۔ لڑکا بھی آدابِ شاہی سے تنگ تھا۔ اُس نے اپنے باپ سے کہا:

ابا جان! آپ دنیا کی محبت میں کھو گئے ہیں۔ اس وجہ سے میں رسوا ہو گیا ہوں۔ میں نے آپ لوگوں سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنے ساتھ ایک قرآن شریف لیا اور خدا حافظ کہہ کر چل دیا۔ بیٹے کو بے سرو ساماں جاتے دیکھ کر ممتاز بیگم کی متا بے چین ہو گئی۔ اُس نے بیٹے کو کچھ زادِ راہ اور نقدی دینے کی کوشش کی مگر بیٹے نے لینے سے انکار کر دیا۔ ممتاز بیگم نے اپنے ہاتھ سے ایک قیمتی انگوٹھی اتار کر زبردستی بیٹے کے ہاتھ میں تھام دی۔ محل سے باہر آکر لڑکا ایک قافلے میں شامل ہو گیا اور بصرہ پہنچ گیا۔

بصرہ پہنچ کر لڑکے نے ایک جنگل میں قیام کیا اور مزدوری کیلئے وہ شہر آ جاتا تھا۔ وہ صرف شنبہ (ہفتہ) کے روز کام کرتا تھا اور ایک درہم ایک دانق مزدوری لیتا تھا۔ وہ روزانہ ایک دانق (درہم کا چھٹا حصہ) خرچ کرتا تھا۔ وہ نہ تو اس سے کم اور نہ ہی زیادہ مزدوری لیتا تھا۔

ابو عامر بصری رحمۃ اللہ علیہ کے گھر کی ایک دیوار گر گئی تو وہ اس کی مرمت کیلئے کسی معمار کی تلاش میں نکلے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں مزدور کا تلاش میں بازار گیا تو ایک جگہ میں نے خوبصورت لڑکے کو بیٹھ دیکھا۔ وہ قرآن شریف کھولے ہوئے پڑھ رہا تھا اور ایک زنبیل اس کے پاس پڑی ہوئی تھی۔ کسی شخص نے بتایا کہ یہ لڑکا بھی مزدوری کرتا ہے۔ میں نے قریب آکر پوچھا:

لڑکے! کیا تم مزدوری کرو گے؟

لڑکا بولا: ہاں ضرور کرونگا لیکن مزدوری ایک درہم ایک دانق سے کم نہیں لونگا۔ نماز کے وقت میں کام نہیں کرونگا کیونکہ مجھے نماز کیلئے جانا ہوگا۔ میں نے لڑکے کی دونوں شرطیں منظور کر لیں اور اسے لاکر دیوار بنانے پر لگا دیا۔ دن کے اختتام پر جب میں لڑکے کے پاس آیا تو وہ اپنا کام ختم کر چکا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس لڑکے نے دس آدمیوں کے برابر کام کیا تھا۔ میں نے بخوشی لڑکے کو دو درہم دینا چاہے تو لڑکے نے طے شدہ اجرت سے زائد رقم لینے انکار کر دیا اور اپنی اجرت ایک درہم اور ایک دانق لیکر چلا گیا۔

دوسرے روز جب میں بازار آیا تو وہ لڑکا وہاں موجود نہ تھا۔ میں نے اس پاس کے لوگوں سے معلوم کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ لڑکا تو صرف ہفتہ کے روز ہی کام کرتا ہے۔ باقی ایام میں ہم نے اسے یہاں کبھی نہیں دیکھا۔ میں لڑکے کے کام سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ باقی ماندہ کام کیلئے میں نے سات دن تک اس کا انتظار کیا۔ ہفتہ کے روز جب میں لڑکے کی تلاش میں بازار آیا تو وہ اُسی جگہ بیٹھا قرآن پڑھ رہا تھا۔ میں نے لڑکے کو سلام کیا اور مزدوری کرنے کیلئے پوچھا تو اس نے اپنی شرطیں دہرائیں تو میں آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لے آیا۔

میں پچھلے ہفتہ کے کام سے ابھی تک حیران تھا کہ اس لڑکے نے اکیلے اتنا کام کیسے کر لیا۔ چنانچہ میں لڑکے کو کام پر لگا کر ایسی جگہ جا چھپا جہاں سے میں اس پر نگاہ رکھ سکوں۔ لڑکے نے گارا تیار کیا اور دیوار پر ڈالنے لگا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ لڑکا گارا ڈالے جا رہا تھا اور پتھر خود بخود دیوار پر لگتے جا رہے تھے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ لڑکا ضرور اللہ کا ولی ہے۔ اسی لئے غیب سے اس کی مدد ہو رہی ہے۔ شام کو کام ختم ہونے پر میں نے اسے تین درہم دینا چاہے تو وہ بولا: یہ اجرت میری ضرورت سے زیادہ ہے میں اتنی رقم کا کیا کروں گا۔ یہ کہہ کر اس نے ایک درہم اور ایک دانق رکھ کر باقی رقم مجھے واپس تھما دی اور وہاں سے چلا گیا۔

میں نے سات دن انتظار کیا اور ہفتہ کے روز بازار آیا تو لڑکے کو مقررہ جگہ پر نہ پایا۔ میں نے اس پاس کے لوگوں سے اس کے متعلق دریافت کیا تو ایک شخص نے بتایا کہ وہ لڑکا تین روز سے بیمار ہے اور فلاں جنگل میں پڑا ہوا ہے۔ میں نے اس شخص کو کچھ اجرت دیکر راضی کر لیا کہ وہ مجھے اس لڑکے کے پاس پہنچا دے۔ اس شخص نے مجھے لڑکے کے پاس پہنچا دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ نیم بیہوشی کی حالت میں اینٹ کا ٹکڑا سر کے نیچے رکھے لیٹا ہوا ہے۔ میں نے اسے سلام کیا تو اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے دوبارہ سلام کیا تو اس نے جواب دیتے ہوئے آنکھ کھولی اور مجھے دیکھ کر پہچان لیا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کا سر اینٹ پر سے اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس نے گود سے سر اٹھاتے ہوئے یہ شعر پڑھے:

یا صاحبی لا تفترو بتنعم فالعمر ینفد والنعم یزول

وانا حملت علی القبور جنازة فاعلم انک بعدها محمول

میرے دوست دنیا کی نعمتوں سے دھوکے میں نہ پڑ، عمر ختم ہوئے جا رہی ہے اور یہ نعمتیں سب ختم ہو جائیں گی۔

جب تو کوئی جنازہ لے کر قبرستان جائے تو یہ سوچنا رہ کہ تیرا بھی ایک دن اسی طرح جنازہ اٹھایا جائیگا۔

یہ اشعار پڑھنے کے بعد اُس نے مجھ سے کہا:

ابو عامر! جب میری روح میرے جسم کا ساتھ چھوڑ جائے تو مجھے نہلا کر اسی کپڑے کا کفن پہنا دینا۔

میں نے کہا: پیارے دوست! میں بازار سے نیا کپڑا لا کر تجھے پہنا دوں گا۔

وہ بولا: نئے کپڑوں کیلئے زندہ لوگ مجھ سے زیادہ مستحق ہیں۔ یہ کفن تو بوسیدہ ہو کر چیتھڑے ہو جاتا ہے مگر آدمی کے ساتھ اُس کے اعمال رہ جاتے ہیں۔

(لڑکے کی بات سن کر مجھے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول یاد آ گیا کہ مجھے انہی پرانی چادروں کا کفن پہنا دینا) میری لنگی اور لوٹا قبر

کھودنے والے کو بطور اجرت دیدینا۔ پھر اُس نے مجھے انگوٹھی اور قرآن پاک دیا اور کہا کہ اسے خلیفہ ہارون الرشید تک پہنچا دینا۔ میری یہ امانت تم خود

اپنے ہاتھ سے اُسے دینا اور کہنا کہ یہ ایک پردیسی لڑکے کی امانت ہے اور اُس نے کہا تھا۔ "ایسا نہ ہو کہ اسی غفلت اور دھوکے کی حالت میں آپ کی

موت آجائے" یہ کہہ کر اُس کی موت واقع ہو گئی۔ اُس وقت مجھے معلوم ہوا کہ یہ لڑکا تو ایک شہزادہ تھا۔

میں نے لڑکے کی وصیت کے مطابق اُسے نہلا کر انہی کپڑوں کا کفن پہنایا اور سپردِ خاک کیا۔ لنگی اور لوٹا گورکن کو دیدیئے اور انگوٹھی اور قرآن پاک

لیکر بغداد روانہ ہو گیا۔ جب میں قصر شاہی کے دروازے پر پہنچا تو بادشاہ کی سواری نکل رہی تھی۔ میں اونچی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ جب امیر المومنین

حفاظی حصار میں میرے سامنے پہنچے تو میں نے با آواز بلند کہا:

امیر المومنین! آپ کو رسول اللہ ﷺ سے رشتہ داری کا واسطہ۔ ذرا میری بات سن لیجئے۔ یہ کہہ کر میں نے انگوٹھی اور قرآن ہاتھوں میں لیکر بلند کر

دیئے اور کہا کہ آپ کی ایک امانت میرے پاس ہے۔

خلیفہ ہارون الرشید نے نظر اٹھا کر میرے ہاتھوں کی جانب دیکھا۔ انگوٹھی اور قرآن کو پہچان کر امیر المومنین نے سر جھکا لیا اور اُس کی آنکھوں سے

آنسو جاری ہو گئے۔ اپنے جذبات پر قابو پا کر اُس نے اپنے دربان سے کہا کہ اس آدمی کو اپنے ساتھ رکھو اور واپسی پر جب میں طلب کروں تو اسے

میرے پاس پہنچا دینا۔

خلیفہ ہارون الرشید جب واپس اپنے محل میں پہنچا تو اُس نے دربان سے کہا: محل کے پردے گرا دو اور پھر اُس آدمی کو میرے پاس لے آؤ تاکہ وہ مجھے

غمناک خبر سنائے۔ یہ کہتے ہوئے اُس کے چہرے پر کرب اور غم نمایاں ہو گیا تھا۔

دربان میرے پاس آیا اور کہنے لگا: میرے دوست! تجھے امیر المومنین نے اندر طلب کیا ہے۔ وہ اس وقت صدمے کی حالت میں ہیں۔ تم اس بات کا خیال رکھنا کہ تمہارے اظہارِ بیاں سے ان کے غم کی شدت میں اضافہ نہ ہو۔ یہ کہہ کر دربان مجھے امیر المومنین کے کمرے تک لے آیا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ تنہا افسردگی کی حالت میں بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے: آؤ اور میرے قریب بیٹھ جاؤ۔ جب میں اُنکے قریب بیٹھ گیا تو کہنے لگے: تم میرے بیٹے کو جانتے ہو؟

میں نے کہا: ہاں میں اُسے جانتا ہوں۔

کہنے لگے: وہ کیا کام کرتا تھا؟

میں نے بتایا کہ وہ اینٹ اور گارے مٹی کی مزدوری کرتا تھا۔

کہنے لگے: کیا تم نے بھی اُس سے کوئی مزدوری کروائی تھی؟

میں نے کہا: ہاں! اُس نے میری دیوار بنائی تھی۔

وہ بولے: تمہیں ذرا بھی اُس کی رسول اللہ ﷺ سے قرابت کا خیال نہ آیا؟ (یاد رہے کہ خلیفہ ہارون الرشید بنو عباس میں سے تھے اور بنو عباس والے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ کے سلسلہٴ اولاد میں سے ہیں اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ بنو عباس کے چچا ہیں)

میں نے کہا: امیر المومنین! میں اللہ تعالیٰ سے اور آپ سے معافی کا طلبگار ہوں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ نوجوان کون ہے؟ یہ سب تو مجھے اُس وقت معلوم ہوا جب وہ قریب المرگ تھا اور اُس نے اپنی امانت میرے سپرد کرتے ہوئے وصیت کی۔

امیر المومنین کہنے لگے: کیا تم نے اپنے ہاتھوں سے اُسے غسل دیا تھا؟

میں نے کہا: ہاں میں نے ہی اپنے ہاتھوں سے اُسے غسل دیا تھا۔ فرطِ جذبات سے امیر المومنین نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور چند اشعار پڑھے جن کا مفہوم کچھ یوں تھا۔

اے مسافر! وہ کہ جس پر میرا دل پگھل رہا ہے اور میری آنکھیں اُس پر آنسو بہا رہی ہیں۔ اے وہ شخص: جس کا مکان (قبر) مجھ سے دور ہے مگر اُس کا غم میرے قریب ہے۔ بیشک موت ہر اچھی خوشی کو غمگین کر دیتی ہے۔ وہ مسافر ایک چاند کا ٹکڑا تھا (مراد اُس کا چہرہ) جو خالص چاندی کی ٹہنی پر تھا (مراد بدن یا جسم)۔ پس وہ چاند کا ٹکڑا اور چاندی کی ٹہنی دونوں قبر میں پہنچ گئے۔

خلیفہ ہارون الرشید نے کہا کہ میں بصرہ میں اپنے بیٹے کی قبر پر جانا چاہتا ہوں۔ ابو عامر بصری رحمۃ اللہ علیہ امیر المومنین کو بیٹے کی قبر پر لے گئے۔ انہوں نے قبر پر فاتحہ خوانی کی اور چند اشعار پڑھے جن کا مفہوم یہ ہے۔

اے مسافر! تو جو اپنے سفر سے اب کبھی بھی نہیں لوٹے گا۔ موت نے کم عمری کے زمانے میں ہی تجھے جلدی سے اُچک لیا۔ اے میری آنکھوں کی

ٹھنڈک! تو میرے لئے لمبی اور مختصر راتوں میں راحت اور دل کا چین ہے۔ تو نے موت کا وہ پیالہ نوش کیا ہے جسے عنقریب تیرا بوڑھا باپ بھی اپنے بڑھاپے میں پیئے گا۔ بلکہ دنیا کا ہر شخص اس کو پیئے گا خواہ وہ جنگل میں رہتا ہو یا پھر شہر میں۔ بیشک سب تعریفیں اُس ذاتِ وحدہ لا شریک کیلئے ہیں جس کی لکھی ہوئی تقدیر کے یہ سب کرشمے ہیں۔

ابو عامر بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جب میں خلیفہ ہارون الرشید کو رخصت کے گھر پہنچا تو اُس رات میں نماز و وظائف سے فارغ ہو کر بستر پر لیٹا تو میں نے خواب میں ایک نُور کا قبہ دیکھا جس اوپر ابر کی طرح نُور ہی نُور پھیلا ہوا ہے۔ اِس نُور کے ابر سے اُس لڑکے نے مجھے پکار کر کہا: اے ابو عامر! اللہ تعالیٰ تجھے جزائے خیر عطا فرمائے کہ تو نے میری تجہیز و تکفین اور وصیت کو پورا کیا۔

میں نے پوچھا: پیارے دوست! تم کس حال میں ہو اور تم پر کیا گذری؟

لڑکا بولا: میں اُس رب کے پاس پہنچا ہوں جو بہت رحیم و کریم ہے اور وہ مجھ سے بہت راضی ہے۔ مجھے میرے مالک نے وہ نعمتیں عطا کی ہیں جو نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھیں، نہ کسی کان نے سنیں اور نہ ہی کسی کے دل میں اُن کا خیال گُذرا۔

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ میں نے اپنے بندوں کیلئے ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں، جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے ان کے متعلق سنا اور نہ کسی دل میں ان کا خیال گُذرا۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: تواریث میں درج ہے کہ وہ لوگ کہ جن کے پہلو رات کو خواب گاہوں سے دور رہتے ہیں (یعنی تہجد گزار) اُن کے لئے اللہ تعالیٰ جل و شانہ نے ایسی چیزیں تیار کر رکھی ہیں کہ جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کسی آدمی کے دل ان تصور گزار، نہ اُن کے متعلق کوئی مقرب فرشتہ جانتا ہے اور نہ کوئی نبی اور رسول جانتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا:

﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً لِّمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ السجدة- 17

کسی شخص کو نہیں معلوم کہ غیب میں ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا کیسا سامان کیا گیا ہے یہ اُن اعمال کا صلہ ہے جو وہ کرتے تھے۔

درِ منشور میں بیان کیا گیا ہے:

اُس لڑکے نے ابو عامر بصری رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر فرمایا ہے: جو بھی دنیا سے اس طرح نکل آیا جیسے کہ میں نکل آیا ہوں، اُس کیلئے بھی یہی انعام و اکرام ہیں جو مجھے عطا ہوئے ہیں۔

تاریخِ روض میں تھوڑی اور تفصیل بتائی گئی ہے:

خلیفہ ہارون الرشید نے بتایا: میرا یہ بیٹا میری بادشاہت سے قبل پیدا ہوا تھا۔ اس نے بہت اچھی تربیت پائی اور قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی اور دیگر کئی علوم حاصل کئے۔ جب میں بادشاہ بنا تو یہ لڑکا مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ میری بادشاہت سے اُس نے کوئی راحت حاصل نہیں کی۔ جب یہ رخصت ہو رہا تھا تو میں نے ہی اس کی ماں سے کہا تھا کہ اس کو یہ انگوٹھی دید و شائد کسی کٹھن وقت میں اس کے کام آ جائے۔ انگوٹھی میں لگا یا قوت بہت قیمتی تھا۔ مگر مرتے وقت اُس نے وہ انگوٹھی بھی واپس کر دی۔ میرا یہ بیٹا اپنی ماں کا بہت فرمانبردار تھا۔

دوستو! جس باپ کی دنیا داری سے یہ لڑکا رنجیدہ ہو کر گیا تھا۔ اُس بادشاہ یعنی ہارون الرشید کا شمار نیک دل بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ انسان خطا کا پتلا ہے اور اتنے بڑے منصب پر کوئی غلطی یا لغزش ہو سکتی ہے مگر بحیثیت مجموعی تاریخ ہارون الرشید کی اچھائیوں سے بھری پڑی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہارون الرشید خلیفہ ہونے کے ساتھ ایک دیندار شخص بھی تھا۔ وہ روزانہ ایک سو نوافل ادا کرتا تھا۔ اپنے ذاتی مال سے روزانہ ایک ہزار درہم صدقہ و خیرات کرتا، وہ ایک سال حج ادا کرتا اور ایک سال جہاد کرتا تھا۔ حج میں سو علمائے اور اُن کے بیٹوں کو ساتھ لیکر جاتا تھا۔ جس سال وہ حج پر نہیں جاتا تھا تین سو آدمیوں کو حج کرواتا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں بہت سخاوت تھی۔

ہم آج اپنے معاشرے پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ ہم اور ہمارے حکمران آج کہاں کھڑے ہیں۔

أَهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ﴿الفاتحہ- 5﴾ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴿الفاتحہ- 6﴾ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ﴿الفاتحہ- 7﴾

اے اللہ! ہم کو سیدھے رستے پر چلا۔ اُن لوگوں کے رستے پر کہ جو تیرے انعام کے مستحق قرار پائے نہ کہ اُن لوگوں کے کہ جو تیرے غضب کا شکار ہوئے اور نہ ہی گمراہوں کے۔ آمین

زبیدہ خاتون اور بن دیکھے کا سودا

زبیدہ خاتون بنت جعفر بن ابو جعفر منصور ہاشمی خاندان سے تھیں۔ خلیفہ ہارن الرشید کی چچا زاد بہن تھیں۔ اُن کا نام "امۃ العزیز" تھا۔ اُن کے دادا منصور بچپن میں اپنی لاڈلی پوتی سے خوب کھیلا کرتے تھے اور پیار سے اُسے "زبیدہ" یعنی دودھ بلونے والی مدھانی کہتے تھے۔ چنانچہ لوگ اُس کا اصل نام امۃ العزیز بھول کر زبیدہ ہی کے نام سے جاننے اور پکارنے لگے۔ زبیدہ جوان ہوئی تو ذوالحجہ 165 ہجری میں اُس کی شادی اپنے چچا زاد ہارون الرشید سے ہو گئی۔ ہارون الرشید نے شادی کی خوشی میں پانچ کروڑ درہم بیت المال سے عوام الناس میں تقسیم کئے اور بہت سی اپنی دولت بھی مستحقین میں تقسیم کی۔ زبیدہ کا شجرہ نسب رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ سے ملتا ہے۔ بہت نیک دل خاتون تھیں۔ ہارون الرشید نے اور بھی شادیاں کیں، لیکن زبیدہ خاتون کا نام ہی تاریخ کی زینت بنا۔

ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ پڑھی لکھی اور دیندار تھی۔ اپنی دولت اللہ کی راہ میں بے دریغ لٹاتی تھی۔ ایک روایت ہے کہ اُس کے محل میں ایک ہزار کنیزیں ہر وقت قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول رہتی تھیں۔ زبیدہ خاتون 193 ہجری میں حج کیلئے مکہ آئیں تو اُن دنوں پانی کی شدید قلت تھی اور اِس کی وجہ سے حجاج کرام بہت تکلیف میں تھے۔ زبیدہ خاتون سے یہ سب دیکھا نہ گیا، اُس نے سلطنت کے مختلف حصوں سے ماہر انجینئر بلوائے اور اُنہیں نہر کھودنے کے انتظامات کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ انجینئر نے سروے کر کے بتایا کہ اِس منصوبے کیلئے سلطنت کے شمال مشرقی علاقے وادی حنین سے نہر نکالنا ممکن ہو گا، مگر زمین کے نشیب فراز اور پہاڑوں کے سبب سینکڑوں مزدوروں کو دن رات سخت محنت کرنا پڑے گی اور منصوبے پر بہت بڑی رقم خرچ ہوگی۔ زبیدہ خاتون نے کہا کہ اگر کدال کی ایک ضرب پر مجھے ایک دینار بھی دینا پڑے تو میں دوں گی۔ چنانچہ زبیدہ خاتون کے حکم سے "نہر زبیدہ" پینتیس کلو میٹر طویل نہر وادی حنین سے مسجدِ نمرہ تک جاتی ہے۔ ایک ہزار سال تک لوگ اِس نہر سے فائدہ اُٹھاتے رہے۔ اِس پر سترہ لاکھ دینار خرچ ہوئے۔ جب یہ حساب زبیدہ خاتون کو پیش کیا گیا، وہ اُس وقت دریائے دجلہ کے کنارے واقع اپنے محل میں تھیں۔ اُنہوں نے بغیر دیکھے اخراجات کے کاغذات دریا برد کر دیئے اور بولیں: اے اللہ! میں نے تیری راہ میں خرچ کی گئی رقم کا شمار نہیں کرنا، تو بھی قیامت کے روز مجھ سے حساب نہ لینا۔

ایک مرتبہ زبیدہ خاتون خلیفہ ہارون الرشید کے ساتھ دریا کے کنارے چہل قدمی کر رہی تھیں کہ اُنہیں ایک جگہ مشہور بزرگ حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے نظر آئے۔ زبیدہ خاتون ٹہلتی ہوئی اُن کے پاس گئی اور پوچھنے لگی: بابا! یہ آپ کیا بنا رہے ہیں؟ حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ میں ریت کے گھر بنا رہا ہوں۔ زبیدہ خاتون کہنے لگیں: بابا! یہ گھر آپ کس کیلئے بنا رہے ہیں؟ حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ جو کوئی اِس گھر کو خریدے گا، میں اُس کیلئے اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کروں گا کہ اے اللہ! تو اِس کے بدلے جنت میں اُسے گھر عطا فرما دے۔ زبیدہ بولی: بابا! تم کتنے میں یہ گھر

بچو گے؟ حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ بولے: اس گھر کی قیمت ایک دینار ہے۔ زبیدہ نے ایک دینار حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ کو دے دیا۔ ہارون الرشید زبیدہ سے کہنے لگا۔ تم جنت میں گھر خرید رہی ہو، وہ بھی ایک فقیر سے؟ زبیدہ نے ہارون الرشید کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور دونوں ٹہلتے ہوئے محل میں واپس لوٹ آئے۔

رات کے وقت جب ہارون الرشید سویا تو اُس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک ایسے محل کے سامنے کھڑا ہے کہ جس پر زبیدہ خاتون کا نام لکھا ہوا ہے۔ ہارون الرشید بڑا خوش ہوا اور اپنی بیوی کا محل سمجھ کر اندر جانے لگا تو دربانوں نے اُسے روک لیا اور کہنے لگے: جنت میں جس کا گھر ہوتا ہے کوئی بھی اُس کی اجازت کے بغیر اندر داخل نہیں ہو سکتا۔ ہارون الرشید دربانوں کی بات سن کر پریشان ہو گیا اور اسی اثنا میں اُس کی آنکھ کھل گئی۔ صبح ہوئی تو ہارون الرشید کے دل میں خیال آیا کہ وہ آج دریا کنارے جائیگا اور اگر حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ آج مجھے مل گئے تو میں بھی گھر ضرور خریدوں گا۔ سارا دن خواب کا منظر ہارون الرشید کی نگاہوں کے سامنے گھومتا رہا۔ دن ڈھلنے لگا تو ہارون الرشید نے زبیدہ خاتون سے کہا کہ چلو ذرا چہل قدمی کیلئے چلتے ہیں۔ دونوں چلتے چلتے دریا کنارے پہنچے تو ہارون الرشید نے دیکھا کہ حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ آج پھر بیٹھے گھر بنا رہے ہیں۔ ہارون الرشید نے قریب جا کر پوچھا: باباجی! یہ آپ کیا بنا رہے ہیں؟ حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ میں ریت کے گھر بنا رہا ہوں۔ ہارون الرشید نے پوچھا کس لئے؟ حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ بولے کہ جو کوئی اس گھر کو خریدے گا، میں اُس کیلئے اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کروں گا کہ اے اللہ! تو اس کے بدلے جنت میں اسے گھر عطا فرما دے۔ ہارون الرشید نے پوچھا: بابا! اس گھر کی قیمت کیا لو گے؟ حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ نے کہا۔ اس گھر کی قیمت تیری پوری بادشاہی ہے۔ ہارون الرشید نے کہا: بابا! کل تو آپ یہ گھر ایک دینار میں دے رہے تھے اور آج مجھ سے پوری بادشاہی مانگ رہے ہیں۔ حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ بولے: کل بن دیکھے کا سودا تھا، اس لئے قیمت بھی کم تھی۔ آج چونکہ تم دیکھ کر آئے ہو، اس لئے قیمت بھی اتنی زیادہ ہی دینی پڑیگی۔

احسان کا بدلہ

خلیفہ مامون الرشید کا دورِ خلافت تھا۔ اُس نے اپنی سلطنت میں بہترین نظامِ حکومت قائم کیا ہوا تھا۔ قانون کی حکمرانی کیلئے مامون الرشید نے پولیس کا بہترین نظام قائم کیا ہوا تھا۔ محکمہ پولیس کا سربراہ عباس تھا جو خلیفہ کے با اعتماد ساتھیوں میں سے تھا۔ ایک روز خلیفہ مامون الرشید ایوانِ خاص میں تشریف فرما تھے کہ اُنہوں نے عباس کو پکارا۔

پولیس کا سربراہ عباس فوراً خلیفہ مامون الرشید کی خدمت میں حاضر ہوتے ہوئے بولا: یا امیر المومنین بندہ حاضر ہے۔

خلیفہ مامون الرشید نے زمین پر پڑے ہوئے زنجیروں میں جکڑے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: عباس! اسے لے جاؤ اور صبح ہمارے دربار میں پیش کرنا۔

پولیس کا سربراہ عباس بیان کرتا ہے: میں نے خلیفہ کا حکم سنا تو پولیس اہلکاروں کو حکم دیا کہ ملزم کو حراست میں لیکر حوالات میں بند کر دیا جائے۔ اچانک مجھے امیر المومنین کے غیض و غضب کا خیال آیا تو میں نے سوچا کہ بہتر ہو گا کہ میں ملزم کو اپنی تحویل میں رکھوں۔ چنانچہ میں اُسے اپنے ساتھ لے آیا اور گھر میں نظر بند کر دیا۔ رات کا وقت تھا کہ اچانک میرے ذہن میں اُس شخص کا خیال آیا تو میں اُس شخص کے پاس گیا تاکہ میں جان سکوں کہ وہ کون ہے اور خلیفہ نے اُسے کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟

میں نے قیدی سے پوچھا: تم کہاں کے رہنے والے ہو؟

قیدی بولا: میں دمشق کا رہنے والا ہوں۔

میں نے کہا: اللہ تعالیٰ دمشق کے رہنے والوں کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ تم کس قبیلے اور گھرانے سے تعلق رکھتے ہو؟

قیدی نے جب اپنے قبیلے کے متعلق بتایا تو میں نے پوچھا کہ تم قبیلے کے فلاں شخص کو جانتے ہو؟

قیدی بولا: محترم! آپ کا دمشق سے کیا واسطہ ہے اور میں دلچسپی کی وجہ جاننا چاہوں گا۔ اگر آپ میرے سوال کا جواب دیں گے تو میں آپ کو اُس شخص کے بارے میں بتاؤں گا۔

قیدی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے بتایا:

یہ اُن دنوں کا ذکر ہے، جب میں دمشق میں گورنر کا افسر تھا۔ دمشق کے لوگوں نے گورنر کے خلاف بغاوت کر دی۔ حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے گورنر اپنے ساتھیوں سمیت قلعہ سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں بھی فرار ہونے والوں کیساتھ تھا مگر بد قسمتی سے کچھ باغی میرا پیچھا کرنے لگے میں بھاگتے ہوئے اُن سے کافی آگے نکل آیا۔ بھاگتے ہوئے مجھے گلی میں گھر کے سامنے ایک آدمی کھڑا نظر آیا تو میں نے اُس سے التجا کی کہ میری

مدد کرو، اللہ تمہاری مدد کریگا۔

میری التجائیں کروہ نیک دل آدمی مجھے گھر کے اندر لے گیا۔ اُس کی بیوی جو دروازے کے اندر کھڑی ہماری باتیں سن رہی تھی، مجھے فوراً لیکر اپنی خوابگاہ میں چھوڑ آئی۔ تھوڑی دیر بعد گھر کے باہر شور بلند ہوا۔ باغی گھر کے مالک سے کہہ رہے تھے کہ وہ شخص تمہارے ہی گھر میں داخل ہوا ہے۔ وہ شخص بولا: آؤ! تم میرے گھر کی تلاشی لے سکتے ہو۔ وہ لوگ گھر کے اندر داخل ہوئے اور کونے کونے میں مجھے تلاش کرنے لگے، آخر کار ناکام ہو کر خواب گاہ کے باہر آکھڑے ہوئے۔ گھر کا مالک اس نازک صورتحال پر کانپ گیا اور میری ٹانگیں بھی خوف سے کپکپانے لگیں، مگر اُسکی بیوی باغیوں کو لعنت و ملامت کرنے لگی تو وہ خوابگاہ کی تلاشی لئے بغیر گھر سے باہر نکل گئے۔ وہ آدمی گھر کے باہر کھڑا ہو گیا اور اُس کی بیوی میرے پاس آئی اور کہنے لگی: اب ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اللہ نے تمہیں باغیوں کے شر سے بچالیا ہے، اب تم پُر سکون ہو جاؤ۔ میں نے اس احسان پر انہیں ڈھیروں دُعائیں دیں۔

وہ شخص بڑا فیاض اور دریا دل تھا، اُس نے مجھے اپنے محل نما گھر کے ایک کمرے میں ٹھہرایا اور مجھے گھر کے فرد کی طرح رکھا۔ اُس نے مجھ پر لطف و کرم اور عنایات کی بارش کر دی اور میری ضرورتوں کا حد سے زیادہ خیال رکھا۔ میں چار ماہ تک اُس کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتا رہا اور اپنے تمام دکھوں کو بھول گیا۔ ایک روز میں نے اپنے مُحسن سے کہا: میرے دوست! بغاوت کا فتنہ اب دب چکا ہے اور شہر میں بھی سکون ہے۔ میں تمہارے دل سے تمہاری عنایات کا مشکور ہوا اور اب جانے کی اجازت چاہوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اب اپنے غلاموں کو تلاش کروں۔

وہ شخص بولا: ہاں دوست! تم ضرور اپنے ساتھیوں کو تلاش کرو مگر واپس ضرور آنا۔ میں گھر سے نکلا اور اپنے غلاموں کی تلاش میں شہر کا کونہ کونہ چھان مارا مگر ڈھونڈنے میں ناکام رہا۔ آخر میں واپس اپنے مُحسن کے پاس لوٹ آیا۔ مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا اور پھر سے میری خدمت گزاری کرنے لگا۔ میں حیران ہوں کہ اُس نے میرے ساتھ اپنوں سا برتاؤ کیا مگر کبھی میرا نام تک نہیں پوچھا۔ وہ ہمیشہ مجھے میری کُنیت سے ہی بلاتا رہا۔

ایک روز میں نے اپنے مُحسن سے کہا: میرے دوست! میں نے اب بغداد جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

وہ بولا: جیسے تمہاری خوشی، مگر پہلے تم بغداد جانو الے قافلے کا معلوم کرو، پھر میں تمہیں روانگی کے روز الوداع کہوں گا۔ میں نے بازار میں گھوم پھر کر بغداد جانو الے قافلے کا معلوم کر لیا اور گھر آکر اپنے مُحسن کو روانگی کے دن سے آگاہ کیا۔ میرا نیک دل مُحسن میری روانگی کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ جبکہ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ شاید وہ کہیں جانے کی تیاری کر رہا ہے۔ روانگی کے روز میرے مُحسن نے مجھے الصبح جگادیا: عباس میرے دوست اٹھو! تمہاری روانگی میں اب زیادہ وقت نہیں ہے، اس لئے جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ میں تیار ہو کر صحن میں آیا تو ایک اعلیٰ نسل کا گھوڑا زین سے آراستہ تیار کھڑا تھا۔ قریب ہی ایک خچر تیار کھڑا تھا اور پاس ہی دو صندوق، نفیس ملبوسات اور جوتے پڑے ہوئے تھے۔ میں حیرانگی سے دیکھتے ہوئے بولا: میرے دوست! یہ سب کیا ہے؟

وہ بولا: میرے دوست! افسوس کہ میں تمہاری مہمانداری اچھے طریقے سے نہ کر سکا، میں اس کیلئے معذرت خواہ ہوں۔ پھر مجھے ایک تلوار دی اور میری کمر پر ایک پیٹی باندھ دی اور گھوڑے پر سوار ہونے میں میری مدد کی اور خدمت کیلئے ایک غلام میرے ساتھ کر دیا۔ خادم خچر پر صندوق لاد کر میرے ساتھ چلنے لگا۔ وہ شخص اور اُس کی بیوی مجھے الوداع کرنے قافلے تک میرے ساتھ آئے۔ جب وہ واپس جانے لگے تو انکی خدمت گزاری اور مہمان نوازی پر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے کہا: میرے دوست! شانِ زندگی کے کسی موڑ پر میں تمہارے احسانوں کا بدلہ اُتار سکوں، میں نے پُر نم آنکھوں سے انہیں واپس بھیجا۔

کئی روز کی مسافت کے بعد میں بغداد پہنچا اور امیر المومنین کی خدمت گزاری میں مصروف ہو گیا۔ مجھے افسوس ہے کہ کاروبار حکومت میں ایسا الجھا کہ پلٹ کر اپنے محسن کی خبر نہ لے سکا۔ اسی لئے میں نے تم سے اُس کے بارے میں پوچھا کہ شائد میں اپنے محسن کے کچھ کام آ سکوں۔ میری کہانی سُن کر قیدی بولا: مجھے غور سے دیکھو، میں ہی وہ شخص ہوں، حوادثِ زمانہ نے میری شناخت مشکل بنا دی ہے۔ شائد اللہ تعالیٰ نے تجھے احسانوں کا بدلہ اُتارنے کا موقع عطا کیا ہے۔

میں نے غور سے اُس شخص کی جانب دیکھا تو مجھے اپنے محسن کا چہرہ نظر آیا۔ میں بیقرار ہو کر اُٹھا اور اُس قیدی شخص کو بیڑیوں سمیت اپنے گلے سے لگا لیا۔ میں اُس کے سر کو بوسہ دیتے ہوئے پوچھا: میرے دوست! تم اس حال کو کیسے پہنچے ہو؟

وہ شخص بولا: میرے دوست! دمشق میں ایک دفعہ پھر تمہارے دور جیسا فتنہ برپا ہوا اور مجھے اُس کا مورد الزام ٹھہرایا گیا۔ مجھے گرفتار کر لیا گیا اور اس قدر تشدد کیا گیا کہ میں زندگی سے ناامید ہو گیا تھا۔ پھر مجھے زنجیروں میں جکڑ کر امیر المومنین کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اُن کے نزدیک میرا کردہ جرم ناقابلِ معافی ہے۔ شہر میں فساد اور ہنگاموں کا پھوٹ پڑنا اور پھر میری اچانک گرفتاری، یہ سب کچھ آنا فانا ہو گیا اور مجھے اپنی وصیت کرنے کا بھی موقع نہ ملا۔ میرا ایک وفادار غلام میرے پیچھے بغداد آیا ہوا ہے اور وہ میرے جاننے والے لوگوں کے پاس ٹھہرا ہوا ہے تاکہ میرے گھر والوں کو حالات سے باخبر رکھ سکے۔

وہ اُمید بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا: میرے دوست! تم مجھے میرے غلام سے ملو تاکہ میں اپنے انجام سے پہلے اُسے اپنی وصیت بتا سکوں۔ اگر تم مجھے اُس سے ملو دو گے تو میں سمجھوں گا کہ تم نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

میں نے اُسے تسلی دی اور کہا: میرے دوست! اللہ نے تمہیں محفوظ جگہ پر پہنچا دیا ہے۔ میں نے رات کے وقت لوہار کو بلوایا اور اُس شخص کا طوق اور بیڑیاں کٹوا دیں۔ پھر اُسے غسل کروایا اور عمدہ لباس زیب تن کروایا اور اُس کے غلام کو بلوایا۔ وہ شخص اپنے غلام کو دیکھ کر رونے لگا اور اسی حالت میں غلام کو اپنی وصیت بتادی۔

میں اپنے محسن کی بیچارگی سے بہت متاثر ہوا اور اُسے بچانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ میں نے کچھ تحائف اور ایک گھوڑا اُس کے حوالے کیا اور اپنے نائب کو

حکم دیا کہ وہ مہمان کو محفوظ راستے سے شہر کے باہر چھوڑ آئے۔ وہ شخص بولا: میرے دوست! اگر میں فرار ہو بھی جاؤں تو خلیفہ کے لوگ مجھے ڈھونڈ نکالیں گے اور قتل کئے بغیر نہیں رہیں گے اس لئے میں بغداد میں ہی رہوں گا اور حالات کی بہتری کا انتظار کروں گا۔ اگر تمہارے لئے کوئی خطرہ پیدا ہوا تو میں حاضر ہو جاؤں گا۔

قیدی رخصت ہو گیا تو میں اپنے بارے میں سوچنے لگا۔ خلیفہ کو جب قیدی کے فرار ہونے کی خبر ہو گی تو وہ یقیناً مجھے نہیں چھوڑے گا۔ اپنے انجام کا سوچ کر میں نے اپنا کفن تیار کر لیا اور پھر غسل کر کے نماز فجر ادا کی۔ نماز سے فارغ ہوا ہی تھا کہ امیر المومنین کا حکم آ گیا کہ میں قیدی کو لیکر فوراً شاہی دربار پہنچوں۔ میں اکیلا جب دربار پہنچا تو امیر المومنین نے پوچھا: عباس! ہمارے مجرم کو ساتھ کیوں نہیں لائے؟

میری خاموشی کو دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا: عباس! اگر مجرم فرار ہو گیا تو مجھے افسوس ہے کہ تمہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔

میں نے کہا: امیر المومنین! پہلے آپ میری بات سن لیں، پھر آپ میرے لئے جو سزا تجویز کریں گے میں بخوشی قبول کر لوں گا۔ میں نے ساری داستان امیر المومنین کو سنائی اور عرض کیا: امیر المومنین! میں نے اپنے محسن سے وفا کا حق ادا کر دیا۔ اب اگر آپ مجھے قتل کروانا چاہتے ہیں تو میں اس کیلئے تیار ہوں، کیونکہ میں اپنا کفن ساتھ لیکر آیا ہوں۔

امیر المومنین بولے: عباس! اللہ تجھے تیرے احسان کا اجر عطا فرمائے۔ مگر تیرا یہ احسان اُس شخص کے احسان سے کہیں کمتر ہے، جو اُس نے تیرے ساتھ کیا۔ کیونکہ جب تو اُس کے دروازے پر پہنچا تھا تو وہ تجھے جانتا تک نہیں تھا مگر اُس نے نہ صرف پناہ دی بلکہ تجھے مہمان بنا کر گھر کے فرد کی طرح رکھا۔ اگر تم مجھے پہلے بتا دیتے تو میں خود تیری طرف سے اُس کے احسان کا بدلہ چکا دیتا۔

میں نے کہا: امیر المومنین! وہ شخص بغداد میں ہی موجود ہے اور حالات پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ مجھے خطرے میں دیکھ کر خود خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی گردن کٹوا دے گا۔

امیر المومنین مامون الرشید نے کہا: عباس! یہ دوسرا احسان ہے جو اُس نے تم پر کیا ہے اور یہ پہلے احسان سے بھی بڑھ کر ہے۔ جاؤ اور اُسے لیکر فوراً میرے پاس پہنچو تاکہ میں خود اُسے تمہارے ساتھ کئے گئے احسانوں کا صلہ ادا کروں۔

میں فوراً اپنے محسن کے پاس گیا اور اُسے یہ خوشخبری سنائی کہ خلیفہ نے تمہیں معاف کر دیا اور وہ تمہیں احسانوں کا بدلہ دینا چاہتے ہیں۔ وہ شخص الحمد للہ کہہ کر سجدے میں گر گیا اور بولا: بیشک اللہ ہی کی ذات حمد و ثنا کے لائق ہے اور وہی ہماری مشکلات کو آسانیوں میں بدل سکتی ہے۔ وہ شخص جلدی سے تیار ہو کر میرے ساتھ شاہی دربار پہنچا۔ امیر المومنین نے شفقت سے اُسے اپنے پاس بٹھایا اور گفتگو کی۔ اُس کے ساتھ کھانا کھایا۔ پھر اُسے دمشق کی گورنری کی پیشکش کی مگر اُس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے معذرت کر لی۔ امیر المومنین نے اُسے خلعتِ فاخرہ اور تحائف دیکر رخصت کیا اور دمشق کے گورنر کو حکمنامہ بھجوایا کہ وہ اس شخص کیساتھ بہتر سلوک کرے۔

عظیم فاتح جرنیل سلطان صلاح الدین ایوبی

یورپ میں عیسائیوں کے روحانی پیشوا پوپ اربن ثانی نے 1095ء میں القدس اور دیگر مقدس مقامات کی آزادی کیلئے مسلمانوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ پوپ اربن ثانی کے اعلانِ جنگ نے عیسائیوں میں مذہبی جنون پیدا کر دیا۔ یہ مسلمانوں سے عیسائیوں کی پہلی صلیبی جنگ تھی، جس میں ایک غریب سے لے کر شہزادوں تک شریک ہوئے۔ القدس کی آزادی کیلئے لڑی جانے والی یہ جنگ عیسائیوں نے جیت لی اور پندرہ جولائی 1099ء کو القدس پر عیسائیوں نے قبضہ کر لیا۔ عیسائی فوجیں اتنی مشتعل تھیں کہ انہوں نے بابِ داؤد کے سامنے ستر ہزار مسلمانوں کو قتل کیا۔ اس طرح عیسائی یروشلم میں عیسائی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

پہلی صلیبی جنگ کے اٹھاسی سال بعد چار جولائی 1187ء کو جنگِ حطین میں صلاح الدین محمد ایوبی نے عیسائیوں کو زبردست شکست دی، جس سے یروشلم میں عیسائیوں کی مملکت لرز کر رہ گئی۔ ستمبر کے وسط تک صلاح الدین محمد ایوبی کی افواج نے بیروت، نابلس، عکہ، یافہ اور سیدون سمیت بہت سے شہروں پر بھی قبضہ کر لیا۔ جنگِ حطین میں عیسائیوں کے بہت سے جنگجو بھی قید ہو کر صلاح الدین محمد ایوبی کے پاس آ گئے۔ سیلین ابیلی نامی جنگجو نے صلاح الدین محمد ایوبی سے درخواست کی کہ اُسے بیت المقدس جانے کی اجازت دے تاکہ وہ وہاں سے اپنے اہل خانہ کو واپس لے آئے۔ صلاح الدین محمد ایوبی نے کہا کہ میں تمہیں اجازت دیتا ہوں، مگر وعدہ کرو کہ وہاں ایک دن سے زیادہ قیام نہیں کرو گے۔ چنانچہ سیلین وعدہ کر کے بیت المقدس چلا گیا۔ بیت المقدس میں اُس وقت ملکہ سبلیا حکمران تھی، اُس نے سیلین کو ہدایت کی کہ وہ شہر کے دفاع کی خاطر فوج کی کمان سنبھالے۔ یوں بیت المقدس میں جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔

صلاح الدین محمد ایوبی عیسائیوں کی طرف سے غافل نہ تھا۔ چنانچہ اُس نے عیسائیوں سے فیصلہ کُن مقابلے کا فیصلہ کیا اور ہنگامی طور پر فوج کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ جب عظیم اسلامی لشکر اپنے سپہ سالار کے حکم سے سامانِ حرب سے لیس ہو کر تیار ہو گیا تو صلاح الدین محمد ایوبی نے بیت المقدس کی جانب کوچ کیا اور بڑی تیزی سے فاصلہ طے کر کے صلاح الدین محمد ایوبی کا لشکر آج بیت المقدس کی فصیلوں کے سامنے کھڑا تھا۔

عیسائیوں کا ایک لشکر مسلمان فوجوں کو بیت المقدس کی فصیلوں سے پیچھے دھکیلنے کیلئے نکلا تو مارگریٹ نامی عیسائی عورت کا شوہر بھی اُس لشکر میں شامل تھا۔ شام ہوئی تو لشکر میں شامل لوگ بھی گھروں کو واپس لوٹنے لگے مگر مارگریٹ کا شوہر ان میں شامل نہیں تھا۔ مارگریٹ اپنے شیر خوار بچے کو سینے سے چمٹائے انجانے اندیشوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ وہ خوفزدہ تھی کہ کہیں اُس کا شوہر لڑائی میں نہ مارا گیا ہو۔ جب بچہ روتا تو مارگریٹ کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل کر گالوں پر بہہ نکلتے۔

مارگریٹ کا شوہر کٹر مذہبی شخص اور ایک بہادر جنگجو تھا۔ جب بھی عیسائیت اور صلیب کے خلاف کوئی بات ہوتی تو یہ شخص عیسائی لشکر میں سب سے

آگے ہوتا۔ مارگریٹ وسوسوں اور اندیشوں میں مبتلا بے چین ہو رہی تھی کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ مارگریٹ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں اُس کے شوہر کی موت کی خبر ہی نہ آئی ہو۔ اُس نے ڈرتے ہوئے دروازہ کھولا تو اُس کے شوہر نے اندر قدم رکھتے ہی اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

پیاری مارگریٹ! ہماری فوج نے یسوع مسیح کے منکروں کو فصیل شہر سے پیچھے دھکیل دیا ہے۔ مارگریٹ! تیرے وطن پر ہمیشہ عیسائیت کا پرچم ہی لہرائے گا۔

مارگریٹ تصور میں کھو کر دیکھ رہی تھی کہ شہر کے نوجوان شہر کی فصیلوں سے مسلمان فوجوں پر پتھر پھینک رہے ہیں اور مسلمان فوجیں پسپا ہو رہی ہیں۔ مارگریٹ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی کہ بیشک صلیب ہی مقدس ہے اور مسیحیت کا پرچم ہمیشہ بلند رہے گا۔

مارگریٹ کا شوہر اُسے لیکر چرچ روانہ ہوا کیونکہ وہ آج کی کامیابی کا جشن منانا چاہتے تھے۔ وہ اُسے مسلمانوں کی درندگی کے جھوٹے قصے سننے لگا۔ مارگریٹ! تم نہیں جانتی کہ صلاح الدین محمد ایوبی ایک خونخوار اور ظالم حکمران ہے، اُس کے سپاہی دشمنوں کا خون پی جاتے ہیں اور گوشت تک کھا جاتے ہیں۔ اسی لئے عیسائی فوجیں ان ظالموں کا خاتمہ چاہتی ہیں۔ وہ اپنے شوہر کے جھوٹ کو سچ جان کر مسلمان فوجوں سے خوفزدہ ہو رہی تھی اور اپنے بچے کو سینے سے لگائے ہوئے یسوع مسیح سے سلامتی کی دُعائیں مانگ رہی تھی۔ وہ تصور میں مساجد کے میناروں کو زمین بوس ہوتے اور عیسائیت کے پرچم کو لہراتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ وہ سمجھنے لگی کہ اب کسی مسجد کے مینار سے اذان کی آواز سنائی نہیں دیگی۔ انہی تصورات میں کھوئی ہوئی مارگریٹ اپنے شوہر سے ساتھ گھر واپس آگئی۔

مارگریٹ بستر پر لیٹی تو تصورات میں اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی کہ اب وہ فوج کا اعلیٰ سپہ سالار بن جایگا۔ وہ بڑے محلات اور خدمتگاروں کی فوج کے تصور میں نیند کی وادیوں میں چلی گئی۔ نیند میں بھی اُسے حسین سپنے دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک اُس کے کانوں میں عورتوں، بچوں، مردوں اور بوڑھوں کی چیخوں کی آوازیں آنے لگیں تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جلدی سے بچے کو اٹھا کر سینے سے لگایا اور پھر اپنے شوہر کے بستر کی طرف دیکھا تو وہ بستر پر موجود نہیں تھا۔

مارگریٹ کو گلی میں لوگوں کی آوازیں سنائی دیں تو وہ دروازے پر آگئی۔ اُس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل کر لوگوں سے پوچھنے لگی۔ یہ سب کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ صلاح الدین محمد ایوبی کی فوجوں نے جبل زیتون پر پڑاؤ ڈال کر شہر کا محاصرہ کر لیا ہے۔ اور اب وہ توپوں اور منجیقوں سے شہر کی فصیل پر گولہ باری اور سنگ باری کر رہے ہیں۔

مارگریٹ کا شوہر حملے کی خبر پاتے ہی گھر سے جا چکا تھا تا کہ صلیبی فوج کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے ساتھ لڑ سکے۔ اپنے شوہر کی باتیں سن کر وہ پر اعتماد تھی کہ شہر کا دفاع مضبوط ہے۔ تقریباً ساٹھ ہزار جنگجو نوجوان شہر کی حفاظت کر رہے ہیں۔ اور مذہبی جذبے سے سرشار مسلمان فوجوں سے نبرد آزما ہیں۔ مارگریٹ کی خوش فہمی جلد ہی مایوسی میں بدل گئی۔

پہلے تو خبر ملی کہ عیسائی فوجوں کے دفاعی حصار ایک ایک کر کے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ ان خبروں کو سُننے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ جب یہ اطلاع ملی کہ صلیبیوں نے ہتھیار ڈال کر اپنی شکست تسلیم کر لی ہے اور اب القدس کے درودیوار پر سفید پرچم لہرا رہے ہیں۔

صلیبیوں کا سلطان صلاح الدین محمد ایوبی سے معاہدہ طے پا گیا ہے۔ عیسائیوں کو فدیہ دیکر شہر چھوڑنے سے جانے کی اجازت ہے اگر وہ رہنا چاہیں تو انہیں سلطان صلاح الدین محمد ایوبی کی محکومی اختیار کرنا ہوگی۔ جبکہ انہیں مسلمانوں کے برابر حقوق حاصل ہونگے۔

عیسائی عوام کو ان کی فوجوں نے انہیں سلطان صلاح الدین محمد ایوبی کے مظالم کی جھوٹی کہانیاں سنا کر اس قدر خوفزدہ کر دیا تھا کہ اکثریت حسبِ توفیق دینار دیکر شہر چھوڑ کر جا رہی تھی۔

مارگریٹ بچے کو سینے سے لگائے خوف میں مبتلا اپنے خاوند کو تلاش کر رہی تھی۔ رات کا اندھیرا چھا چکا تھا مگر اُس کے شوہر کا کچھ پتہ نہ تھا۔ وہ سہمی ہوئی شہر کی فصیل کے پاس آگئی۔ اُس نے دیکھا کہ اسلامی فوجیں بڑی شان سے شہر میں داخل ہو رہی ہیں، وہ ہاتھوں میں قدیلیں لئے فتح کا طبل بجاتے ہوئے شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ مارگریٹ انہیں دیکھتی ہوئی میدانِ جنگ میں آگئی جہاں صلیبی پرچموں اور گلی سڑی اور کٹی ہوئی لاشوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ وہ دہشت زدہ ہو کر پلٹنے لگی تو شوہر کی محبت غالب آگئی۔ وہ گھنٹوں بچہ بغل میں لئے ان جلی کٹی لاشوں کو الٹ پلٹ کر اپنے شوہر کو تلاش کر رہی تھی۔ اُس کے ارد گرد ہزاروں لوگ اپنے پیاروں کو تلاش کر لیتے۔ اگر کسی کو اپنے عزیز کی لاش مل جاتی تو رونے اور چیخنے کی آوازیں بلند ہونے لگتیں۔ مارگریٹ اب تھک چکی تھی مگر اُس کے شوہر کا کچھ پتہ نہ تھا۔

مارگریٹ سوچ رہی تھی کہ نہ جانے اُس کے شوہر کی لاش کس حالت میں ہوگی؟ پھر اُسکی سوچوں کا دھارا صلیبیوں کے سوسالہ اقتدار کی جانب مڑ گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ عیسائی کس طرح اپنے اقتدار کو مضبوط رکھنے کیلئے بہادری کے جھوٹے قصے سناتے تھے اور پھر مسلمانوں کے سامنے اُن کا یہ اقتدار سمندر کی جھاگ کی مانند آنا فنا ختم ہو گیا۔ سارے اہل یورپ مل کر ایک مسلمان حکمران کا مقابلہ نہ کر سکے، جب سب مسلمان حکمران مل جائیں گے تو یورپ والوں کا کیا ہوگا؟

مارگریٹ ایک طرف تو عیسائیوں کے اقتدار کے متعلق سوچ رہی تھی تو دوسری طرف وہ اپنے شوہر کو تلاش کر رہی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ کل تک سرزمین القدس پر شان سے پھرنے والے آج خاک نشین ہو چکے ہیں۔ وہ یہی سوچتی جا رہی تھی کہ ایک بوڑھے نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ اُس نے دیکھا تو وہ شخص اُس کے محلے کا تھا اور اُس کے خاوند کو جانتا تھا۔ مارگریٹ نے پوچھا: باباجان! آپ نے میرے شوہر کو کہاں دیکھا ہے؟ بوڑھے نے اُسے مایوس کرنے کی بجائے دلاسا دیا اور لیکر گھر کی جانب چل پڑا۔

مارگریٹ نے پوچھا: باباجان سچ بتائیں! کیا یہ فاتح لوگ مجھے اور میرے بچے کو کھا جائیں گے؟ بوڑھا بولا! یہ جھوٹی باتیں تمہیں کس نے بتائی ہیں؟ پھر وہ بولا! آج سے سوسال قبل جب عیسائی القدس میں فاتح بن کر داخل ہوئے تھے۔ تو ایک دن میں ستر ہزار بے گناہ لوگوں کو گھروں اور گلیوں میں قتل

کیا تھا۔ جن میں بچے بوڑھے اور عورتیں شامل تھے۔ اُس دن کی درندگی پر آج تک ہمیں شرمندگی نہیں ہوئی۔ آج اگر وہ ہمیں بدلے میں ذبح بھی کر ڈالتے تو زیادتی نہیں بلکہ انصاف ہوتا۔ مگر تم حوصلہ رکھو! سلطان صلاح الدین محمد ایوبی ایک بہادر، نیک دل اور رحم دل حکمران ہے، بادشاہ یقیناً ایسے ہی ہوتے ہیں۔

مارگریٹ بوڑھے کیساتھ گھر آگئی، رات فکر و غم میں گزر گئی۔ صبح ہوئی تو مارگریٹ شوہر کی جدائی میں نڈھال ہو چکی تھی۔ گھر ابٹ دور کرنے کیلئے وہ پڑوسیوں کے ہاں چلی گئی۔ اچانک واویلا شروع ہو گیا۔ وہ پڑوسن کیساتھ گھر سے باہر نکلی تو بازاروں میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی ٹولیاں جمع ہونے لگی تھیں۔ مسلمان نعرہٴ تکبیر بلند کر رہے تھے جبکہ عیسائی آہ و زاری اور واویلا کر رہے تھے۔ پھر لوگوں نے دیکھا کہ جو شیلے مسلمان نوجوان نے قبتہ الصخرہ پر چڑھ کر ایک صدی سے نصب صلیب اتار پھینکی۔ عیسائی گمان کرتے تھے کہ اب یہ صلیب قیامت تک یوں ہی رہے گی۔

عیسائی عوام اپنے حکمرانوں کی گمراہ کن باتوں کی وجہ سے پریشان تھے۔ اب اُن کے پاس مسلمانوں کے حُسنِ سلوک کی خبریں پہنچنے لگیں تو اُنہیں بڑا تعجب ہو رہا تھا۔ مسلمانوں نے کسی کے مال کو ہاتھ نہیں لگایا، کسی عورت کی عصمت دری نہیں کی اور نہ کسی بے گناہ کا خون بہایا۔ سلطان صلاح الدین محمد ایوبی نے اعلان کر دیا تھا کہ جو عیسائی شہر سے جانا چاہتے ہیں وہ حسبِ توفیق فدیہ ادا کر کے جا سکتے ہیں اور جو رہنا چاہیں، وہ محکوم بن کر رہیں مگر اُنہیں مسلمانوں کے برابر حقوق حاصل ہونگے۔ پھر یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ جو عیسائی شہر چھوڑ کر جا رہے تھے، مسلمان اُن کا سامان قیمتاً خرید رہے تھے۔

بیت المقدس سے تمام نصاریٰ کی بدعتیں ہٹا دی گئیں اور نور الدین زنگی شہید کا منبر حرم میں رکھ کر خطبہ دیا گیا۔ حرم کے صحن میں نمازیوں کے علاوہ عیسائی بھی موجود تھے اور خطبہ سن رہے تھے۔ خطبہ لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں میں اتر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے خطبہ سُن کر پہاڑ اور ٹیلے بھی حرکت کرنے لگیں گے۔ ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ مجھے یقین ہو گیا کہ جب تک مسلمان ایسے ہی رہیں گے، پوری دُنیا مل کر بھی شکست نہیں دے سکتی۔ کیونکہ ان کے دلوں میں ایمان کی ایسی قوت ہے کہ مسلمان شہادت کو شوق سے گلے لگا لیتے ہیں۔ ہمیں اس ملک پر قبضے کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے کیونکہ مسلمان قوم کا ہر فرد صلاح الدین محمد ایوبی ہے۔ اس لئے ہمیں اپنی جانیں بلاوجہ ضائع نہیں کرنی چاہئیں۔

عیسائیوں کے ایک گروہ نے سلطان صلاح الدین محمد ایوبی کے عادلانہ اور منصفانہ نظام کی وجہ سے وہیں رکنے کا فیصلہ کیا جبکہ دوسرا گروہ شہر سے کوچ کر جانے پر مُصر تھا۔ مارگریٹ نے بھی دوسرے گروہ کا انتخاب کیا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہاں گزارے ہوئے حُسنِ لمحوں کی یاد اُسے تڑپاتی رہے۔ شہر سے نکلتے ہوئے اپنے پیاروں اور بچھڑے ہوئے عزیزوں کو یاد کر کے عورتیں رونے لگیں۔ ایک مسلمان فوجی دستے نے اُنہیں روتے دیکھا تو اپنے ساتھ لے گئے۔ جب یہ لوگ ایک فوجی پڑاؤ کے پاس پہنچے تو وہاں انہیں ایک باریش اور حُسنِ سوار نظر آیا۔ آس پاس کے لوگوں کی سرگوشیوں سے مارگریٹ کو پتہ چلا کہ یہ مسلمان سپہ سالار سلطان صلاح الدین محمد ایوبی ہے۔ مارگریٹ نے نظر اٹھا کر اُسے دیکھا تو اُسے چہرے پر نور و جلال، ہیبت اور رُعب نظر آیا۔ سلطان صلاح الدین محمد ایوبی نے عورتوں سے پوچھا کہ وہ کیوں رورہی ہیں؟ عورتوں نے بتایا کہ ہمارے عزیز واقارب اور شوہر یا تو

آپ کی قید میں ہیں یا پھر مارے جا چکے ہیں۔ بے بس اور مجبور عورتوں کو روتا دیکھ کر سلطان صلاح الدین محمد ایوبی کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ اُس نے فوراً قیدیوں کو رہا کرنے کا حکم دیا۔ جب قیدی لائے گئے تو اُن میں مارگریٹ کا شوہر بھی تھا۔ مارگریٹ شوہر کو سامنے پا کر تمام غم بھول گئی اور لوگوں کے سامنے ہی اپنے شوہر سے لپٹ گئی۔ سلطان صلاح الدین محمد ایوبی ان لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوا اور انہیں زادِ راہ دیکر رخصت کیا۔

مارگریٹ نے اپنے روحانی پوپ سے سلطان صلاح الدین محمد ایوبی کا موازنہ کیا اور اُس کی ذات میں خامیاں تلاش کرنے لگی، عیسائیوں کا پوپ اعظم تمام چرچوں کے خزانے سمیٹ کر اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ وہ چاہتا تو قافلے کے ہر فرد کو اُس کی ضرورت کا سامان مہیا کر سکتا تھا۔ مگر اُس نے کسی کو ایک پائی تک نہیں دی اور دوسری طرف مسلمان حکمران سلطان صلاح الدین محمد ایوبی تھا کہ جس نے قافلے کے ہر فرد کو ضرورت کا سامان دیکر رخصت کیا اور معاہدے کے باوجود نہ صرف انہیں اپنا مال و اسباب لے جانے کی اجازت دی بلکہ اُن کا چھوڑا ہوا سامان مسلمانوں نے قیمتاً خرید لیا۔ یہ سب دیکھ کر عیسائیوں کی نظروں میں پوپ اعظم کا بھانڈا پھوٹ چکا تھا۔ قافلے میں راستے سے بے سرو سامان لوگ بھی شامل ہو گئے تھے۔ ان میں سے کئی بھوک پیاس سے زندگی کی بازی ہار گئے مگر پوپ اعظم نے کسی کو نوالہ تک نہیں دیا۔ آخر کار گرتے پڑتے یہ قافلہ طرابلس پہنچ گیا۔

قافلہ طرابلس کے مرکزی دروازے پر پہنچا تو وہاں کے عیسائی نے دروازے بند کروادیئے اور قافلے میں لوٹ مار کیلئے ڈاکو بھیج دیئے۔ ڈاکوؤں نے لوٹ مار شروع کی تو قافلے کے جوان مقابلے کیلئے نکلے۔ ان میں زیادہ تر ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے گئے۔ مرنے والوں میں مارگریٹ کا شوہر بھی تھا۔ بچے کچے قافلے کے کچھ لوگ تو واپس القدس لوٹ گئے اور باقی لوگوں نے انطاکیہ کا رخ کیا۔ مارگریٹ بھی انطاکیہ جانے والوں کے ساتھ تھی۔ انطاکیہ میں بھی عیسائی حکومت تھی، انہوں نے قافلے والوں کو شہر میں داخل ہونے سے روک دیا۔ مجبوراً یہ لوگ بھی ارض مقدس کی طرف لوٹ گئے۔ مارگریٹ تھک چکی تھی اور اُس پاؤں بھی تھکاوٹ سے شل ہو گئے تھے، اس لئے وہ قافلے کے ساتھ جانے کی بجائے وہیں زمین پر لیٹ گئی اور آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو اپنے پاس ایک ہم مذہب جوان کو پایا جو اُسے ساحل سمندر کے پاس اپنے خیمے میں لے گیا۔ وہ تھکاوٹ کی وجہ سے خیمے میں لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اُسے دو آدمیوں کی گفتگو سنائی دی۔

ایک آدمی بولا! یہ میرا شکار ہے اور اس پر میرا حق ہے۔ دوسرا آدمی بولا! ہم تجھے اکیلا اس عورت کے پاس نہیں چھوڑ سکتے۔ مارگریٹ سمجھ گئی کہ یہ گفتگو میرے متعلق ہی ہو رہی ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ میں دشمن مسلمانوں میں تھی تو میری جان و مال اور عزت و آبرو اور میرا شوہر سب محفوظ تھے۔ پھر میں اپنوں میں چلی آئی تو میرا شوہر میری ہی قوم کے ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارا گیا اور آج یہ درندے میری آبرو کے دشمن بن گئے ہیں۔ وہ غضبناک ہو کر اٹھی اور خیمے سے باہر آگئی۔ وہ چلا کر بولی: افسوس ہے اہل یورپ تم پر! کیا یہی تمہارا دین ہے؟ اور یہ تمہاری انسانیت ہے کہ جس کا تم ساری دُنیا میں پرچار کرتے ہو؟ اور تمہاری شرافت اور مروت کا تو جواب نہیں۔

مارگریٹ کی باتیں سن کر دونوں وحشیوں کی طرح ہنس رہے تھے۔ مارگریٹ کا غصہ اور بھڑک اٹھا، وہ چلا کر بولی! تم کو کسی زبان سمجھتے ہو۔ تم عیسائی

نہیں بلکہ کافر ہو، تم انسان کی کھامیں چھپے ہوئے درندے ہو، شرافت اور مروت تو نام کی بھی نہیں، تم پر ہلاکت ہو۔ جن مسلمانوں کی درندگی کی تم جھوٹی داستانیں سناتے تھے، وہ دشمن ہو کر بھی تمہاری عورتوں کی آبرو پر ہاتھ نہیں ڈالتے اور تمہاری عورتوں کے تم سے بڑھ کر محافظ ہیں۔ وہ لوگ تم سے زیادہ شرافت اور فضیلت والے ہیں۔

اللہ کی قسم! تم میں شرم و حیاء نام کی کوئی چیز نہیں اور نہ ہی تم لوگوں میں کوئی شرافت اور مروت ہے۔ نہ تو تم مسیح کے امتی ہو اور نہ محمد ﷺ کے۔ بلکہ شیطان کے چیلے ہو۔ جبکہ محمد ﷺ کے امتی، مسیح کے بھی امتی ہیں۔ وہ لوگ شرافت و انسانیت کے پیکر ہیں۔ وہ لوگ تم سے زیادہ یسوع کے وفادار ہیں۔ یاد رکھو! فتح و نصرت اُن کا مقدر ہے، تم اُن سے ارضِ مقدس نہیں چھین سکتے۔ میں انسانیت کے اُن پیکروں کو سلام کرتی ہوں۔ اور تم! تم پر تو اللہ کی لعنت ہو اللہ تمہیں برباد کرے، رُسوائی تمہارا مقدر ہے۔

مارگریٹ کی باتیں سن کر دونوں اور بلند آواز سے تہقہ لگانے لگے۔ اُن کی ہنسی میں مارگریٹ کو وحشت اور خونخواری نظر آئی۔ اُس نے چاروں جانب نظر دوڑائی مگر کوئی پاسباں نظر نہیں آیا۔ دونوں درندوں کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا اور وہ اُس پر جھپٹنے والے تھے وہ کوئی راہ نہ پا کر بچے کو اٹھا کر سمندر کی جانب بھاگی، اس سے پہلے کہ درندے کچھ سمجھتے، وہ سمندر میں کود گئی۔ سمندر کے پانی پر کچھ بلبے اُٹھے اور پھر مکمل سکوت طاری ہو گیا۔ آج ایک عیسائی عورت اپنے ہی ہم مذہبوں کے ہاتھوں رسوا ہونے سے بچنے کیلئے سمندر کی گہرائیوں میں ابدی نیند سو گئی اور اپنے بچے کو بھی اس نام نہاد اور ظالم عیسائیت کا پرچار کرنے والوں سے بچا کر لے گئی۔

سندباد جہازی کا سمندری سفر

خلیفہ ہارون الرشید خلافت عباسیہ کے بہترین حکمرانوں میں سے ایک تھا۔ وہ ایک عادل، نیکدل اور دین دار خلیفہ تھا۔ اُس دور میں بغداد دُنیا کا حسین ترین تجارتی شہر تھا۔ شہر بغداد میں سندباد جہازی نامی مالدار تاجر رہتا تھا۔ سندباد بڑا نیک دل، مہمان نواز اور سخی شخص تھا۔ ایک روز جب گرمیوں کا موسم تھا۔ سندباد اپنے دوستوں کے ساتھ اپنے محل کے خوبصورت باغ میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ سندباد اپنے دوستوں سے کہنے لگا: دوستو! میں تمہیں آج اپنی کہانی سناتا ہوں کہ تمہارا یہ دوست سندباد جہازی زندگی کا سفر طے کر کے یہاں تک کیسے پہنچا؟

بہت دنوں پہلے کی بات ہے کہ جب میں ایک غریب اور عام سا شخص تھا۔ نوجوانی کے دور سے نکل کر جوانی میں قدم رکھا تو تنگدستی اور بیروزگاری نے میرے گھر میں ڈیرے جمار کھے تھے۔ جوانی تو حسین خوابوں کا دور ہوتا ہے مگر یہ سب کچھ میری زندگی سے بہت دور تھا۔ جوان آرزوؤں کے حسین خواب پورے کرنے کیلئے میں نے اپنا آبائی گھر سامان سمیت تین ہزار درہم میں بیچا اور کچھ سامان تجارت خرید کر بصرہ کی بندرگاہ پر پہنچا، جہاں سے تاجر اپنا تجارتی سامان بحری جہازوں میں لیکر دوسرے ملکوں میں جاتے اور اپنا سامان تجارت بیچ کر وہاں سے قیمتی ہیرے جواہرات خرید کر واپس بصرہ لوٹ آتے۔ جب میں بندرگاہ پر پہنچا تو بحری جہاز سفر پر جانے کیلئے بالکل تیار تھا۔ میں نے جہاز کے کپتان سے بات کی تو وہ بمشکل راضی ہوا۔ چنانچہ میں نے جلدی سے اپنا سامان جہاز میں رکھوایا اور سوار ہو گیا۔

ایک ہفتے بعد جہاز نے لنگر اٹھا دیئے اور جہاز میں موجود تمام مسافروں نے محفوظ سفر کیلئے دُعا میں مانگتے ہوئے ہاتھ ہلا ہلا کر اپنے عزیز واقارب کو خداحافظ کہا۔ جہاز گہرے پانیوں میں اترتا تو اُس کا رخ مشرق کی جانب ہو گیا۔ ہمارے دن اور راتیں سمندر کے پانیوں کو دیکھتے ہوئے گزریں۔ جہاز کئی روز تک کھلے سمندر میں سفر کرتا ہوا آخر کار ایک بندرگاہ پر لنگر انداز ہو گیا۔ ہم نے اس شہر سے کچھ اور سامان خرید کر جہاز میں رکھ لیا۔ جہاز اسی طرح سفر کرتا ہوا کئی بندرگاہوں پر رُکا۔ سب لوگ اپنی استعداد کے مطابق سامان تجارت کی خرید و فروخت کرتے رہے۔

سمندر میں سفر کرتے ہوئے بہت روز گزر گئے۔ بحری جہاز کی زندگی بھی عجیب ہوتی ہے۔ جہاں کھانا اور پانی وقفے وقفے سے مخصوص مقدار میں فراہم کیا جاتا ہے، تاکہ کسی ناگہانی صورتحال کا سامنا کیا جاسکے۔ جہاز کے سفر میں ہوا کی موافقت اور سمندر کا پرسکون ہونا نہایت اہم ہوتا ہے۔ ایک روز جہاز اچانک ایک جزیرے کے پاس پہنچ گیا۔ جہاز کا کپتان حیرت سے چلا اٹھا۔ ارے حیرت ہے کہ میں نے اتنے سمندری سفر کئے ہیں مگر پہلی بار یہ جزیرہ دیکھا ہے۔ چھوٹی چھوٹی گھاس پھوس دیکھ کر لگتا ہے کہ ضرور تازہ پانی ملے گا۔ یہ کہتے ہوئے کپتان نے جہاز کو جزیرے کے قریب لا کر کھڑا کر دیا۔ کچھ لوگ برتن لیکر جزیرے پر اتر گئے اور کئی لوگ محض سیر کیلئے نکل پڑے، میں بھی اُن لوگوں کیساتھ جزیرے پر اتر گیا۔ کچھ لوگ کھانا بھی ساتھ لے آئے تھے، اُنہوں نے گھاس پھوس اکٹھی کر کے آگ جلائی اور کھانا گرم لگے۔ کچھ لوگ تفریح کیلئے نکل پڑے، میں بھی ٹہلتے ٹہلتے کچھ دور نکل گیا۔

اچانک جزیرہ ہلنے لگا۔ سب مسافر پریشان ہو گئے۔ کپتان ایک تجربہ کار آدمی تھا، وہ زور سے چلایا: سب لوگ جلدی سے جہاز پر سوار ہو جاؤ، یہ کوئی جزیرہ نہیں ہے بلکہ حوت نامی مچھلی ہے۔ (حوت عربی میں مچھلی کو کہتے ہیں، سب سے بڑی مچھلی شارک پائی گئی ہے جس کا وزن پچھتر ہزار پاؤنڈ اور لمبائی پینسٹھ فٹ تک ہوتی ہے) جو نہ جانے کب سے سطح سمندر پر سو رہی تھی اور اب آگ کی تپش سے جاگ گئی ہے۔ لہذا تم لوگ جلدی سے جہاز پر سوار ہو جاؤ۔ سبھی لوگ جہاز کے قریب تھے وہ بھاگ کر جہاز پر سوار ہو گئے۔ میں اُس وقت جہاز سے زیادہ دور تھا۔ کپتان کی پکار سنتے ہی میں بھی بھاگا مگر میرے جہاز تک پہنچنے سے پہلے ہی جزیرہ جوہل رہا تھا، اچانک پانی کے اندر غائب ہونے لگا۔ اُسی وقت اچانک زور کی آندھی آئی اور مجھے جہاز سے دور پھینک دیا۔ میرے ہوش و حواس جاتے رہے، جب ہوش میں آیا پانی میں تو ڈوبکیاں کھا رہا تھا۔ میرے نزدیک نہ جزیرہ تھا اور نہ ہی جہاز۔

اس پریشان کن صورتحال میں اللہ سے دُعائیں مانگنے لگا: اے اللہ! میں اس طرح بے گور و کفن نہیں مرنا چاہتا۔ تو بڑا غفور و رحیم ہے، تو مجھ پر رحم فرما۔ اللہ نے میری دُعائیں لی، ایک بڑی لہر آئی اور ایک بڑا سابر تن میرے قریب لے آئی۔ میں نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر برتن کو پکڑ لیا۔ سمندر کی لہریں برتن کو کبھی ایک طرف بہا لے جاتیں تو کبھی دوسری طرف۔ برتن کیساتھ سمندر کی موجوں کے تھپڑے کھاتے ہوئے مجھے دودن اور دو راتیں بیت چکی تھیں۔ میرے ہاتھ سُن ہو چکے تھے اور بازو شل ہو گئے تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر برتن میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تو پھر موت ہی میرا مقدر ہوگی۔ جب ذرا اپنے حواس میں ہوتا تو گڑگڑا کر اللہ سے دُعائیں مانگتا کہ وہ مجھے ساحل تک پہنچا دے۔ نہ جانے کب میں بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو کر بیہوش ہو گیا۔ نیم بیہوشی کی حالت میں مجھے زمین نظر آئی اور میں زمین زمین چلاتے ہوئے دوبارہ بیہوش ہو گیا۔ میرے ایک جگہ پڑے رہنے سے میری توانائی قدرے بحال ہوئی تو خود کو ایک درخت کے نیچے پایا۔ بچ جانے کی خوشی نے مجھے بھوک اور پیاس بھلا دی اور میں خوش ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے اپنے آپ سے کہا: سنبادا! تم زندہ بچ جانے پر اللہ کا شکر ادا کرو اور کھانے پینے کیلئے کچھ تلاش کرو۔ چلتے ہوئے میری نظر اپنی ٹانگوں اور پیروں پر پڑی تو ان پر زخموں سے خون نکل کر جم چکا تھا، غالباً سمندر میں مچھلیاں کاٹی رہی تھیں۔ مجھے کمزوری کی وجہ سے چلنے میں دشواری ہو رہی تھی تو میں زمین پر بیٹھ گیا اور گھسٹ گھسٹ کر چلنے لگا۔ نفاہت کی وجہ سے کبھی تو مجھے دھندلا نظر آتا اور کبھی صاف دکھائی دینے لگتا۔ اچانک میں کسی چیز سے ٹکرایا، میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو مجھے ایک پھلدار درخت نظر آیا اور سامنے ایک صاف اور شفاف پانی کی ندی بہہ رہی تھی۔ یہ سب دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی اور پکار اٹھا:

اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے مجھے زندگی کی طرف لوٹا دیا۔ میں رب کریم کے شکر کا ورد کرتے ہوئے ندی تک پہنچا۔ پہلے توجی بھر کر پانی پیا، پھر اپنے زخموں کو دھوتے ہوئے اپنے بدن کو صاف کیا اور درخت سے تازہ پھل اُتار کر کھائے۔ میں ذرا سستانے کیلئے لیٹا تو گہری نیند میں چلا گیا۔ سورج کی روشنی اور پرندوں کی چپھانے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ کچھ دن میرا یہی معمول رہا کہ کھاپی کر آرام کیلئے لیٹ جاتا۔ چند دنوں میں میرے جسم کی توانائی بحال ہو گئی اور پاؤں کے زخم بھی ٹھیک ہو گئے۔ اب میں اپنے آپ کو پہلے کی طرح چاق و چوبند محسوس کرنے لگا۔

میرے پیچھے سمندر اور آگے خشکی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ کونسی جگہ ہے۔ یہاں رکنے کا بھی کوئی فائدہ نظر نہیں آ رہا تھا، جانے کوئی بحری جہاز ادھر آئیگا بھی کہ نہیں۔ میں نے جہاز کا انتظار کرنے کی بجائے خشکی کی طرف سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک اُمید کے سہارے میں چلنے لگا تو میرا خیال تھا کہ خشکی پر درخت اور ندیاں ہوں گے مگر سب کچھ میری سوچ کے برعکس نکلا۔ جب سفر کرتے ہوئے کافی وقت گزر گیا تو میں نے اپنے آپ کو بیابان میں پایا، میرا آگے پیچھے اور دائیں بائیں خشکی ہی خشکی نظر آرہی تھی۔ کسی درخت یا ندی کا نام و نشان نہ تھا۔ نہ پرندے اور جانور ہی نظر آرہے تھے۔ اب مجھ پر وحشت طاری ہونے لگی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ آگے بڑھوں یا پیچھے لوٹ جاؤں۔ پھر خیال آیا کہ پیچھے لوٹا تو پھر سمندر آجائیگا اور آگے جانے کا راستہ بند ہو جائیگا۔ بہتر یہی کہ اچھی اُمید کیلئے آگے چلتا جاؤں۔

میں اللہ سے دُعا مانگتے ہوئے چلا جا رہا تھا کہ وہ مجھے کسی منزل تک پہنچا دے۔ میرے دماغ میں بغداد کی رونقوں اور پھر اس ویران بیابان جگہ کا خیال آیا۔ جہاں نہ آدم اور نہ آدم زاد۔ میں خوفزدہ سا سہا ہوا چلا جا رہا تھا۔ میری سوچیں نا اُمیدی کی طرف اور نظریں زمین کی طرف تھیں۔ اچانک مجھے گھوڑے کے ہنہانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے نظریں اوپر اٹھائیں تو سامنے ایک خوبصورت گھوڑا نظر آیا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ گھوڑا ہے یا چھلوا (چھلوا پوشیدہ مخلوق کو کہتے ہیں، جو کبھی کبھی زمینی مخلوق کا روپ دھار لیتی ہے) اگر یہ واقعی گھوڑا ہے تو میں یقیناً کسی آبادی کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ میں گھوڑے کی طرف حیرانی سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک گر جدار آواز سنائی دی: خبردار! گھوڑے کو ہاتھ مت لگانا، ورنہ میرا تیر تمہارے سینے کے پار نکل جائیگا۔ گر جدار آواز سن کر میں پہلے تو سہم گیا مگر پھر ایک آدمی کو دیکھ کر خوش ہوا جو میری طرف بھاگا چلا آ رہا تھا۔ وہ آدمی قریب آیا تو میں نے کہا: بھائی! معاف کرنا، میں ایک مسافر ہوں اور گھوڑے کو نظر بھر کر دیکھا ضرور ہے مگر چھو انہیں۔

اُس آدمی نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے لاکار: کون ہو تم اور یہاں کیوں آئے ہو؟

اُس کے سوال کے جواب میں میں نے اپنی داستان اُسے سنائی۔ میری حالت کو دیکھتے ہوئے اُس نے میری باتوں پر یقین کر لیا اور میرا ہاتھ تھام کر مجھے ایک غار میں لے گیا۔ غار اندر سے کُشاہ تھا، اُس نے مجھے دسترخوان پر بٹھایا اور پھر کھانا پیش کیا۔ ایک عرصے بعد کھانا نصیب ہوا تو میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے جلدی جلدی کھانے لگا۔

وہ آدمی بولا: اجنبی! واقعی اللہ تعالیٰ نے تم پر بڑا کرم کیا ہے۔ میں نے بتایا کہ میرا نام سندباد ہے اور مجھے سیاحت کا بڑا شوق ہے، اسی لئے اپنا سب کچھ بیچ کر نکل پڑا اور پھر میں حالات کی ٹھوکریں کھاتا ہوا بے سروسامان یہاں پہنچ گیا۔ پھر ہم آپس میں باتیں کرنے لگے۔ اُس آدمی نے بتایا کہ بادشاہ سلامت ہر سال ایک ہفتے کیلئے اپنے بہترین گھوڑوں کو اس جزیرے میں بھیجتے ہیں کیونکہ اس جزیرے کی آب و ہوا گھوڑوں کیلئے بہت عمدہ ہے۔ اس سُنسان جزیرے میں ہر سال سرکاری ملازمین سامانِ خور و نوش اور گھوڑوں کے ساتھ یہاں آتے ہیں اور ہفتہ بھر گھوڑوں کو ہوا خوری کروا کر واپس لوٹ جاتے ہیں۔ ہم باتیں کر رہے تھے کہ دوسرے ملازمین بھی گھوڑے لیکر واپس آ گئے۔ اُس شخص نے میری سرگزشت اُن لوگوں کو سنائی تو وہ

بھی میرے ساتھ ہمدردی کرنے لگے اور انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ مجھے بھی ساتھ لیتے جائیں گے۔

جب قافلہ واپس جانے لگا تو انہوں نے مجھے ایک خوبصورت گھوڑا دیا راستے میں ہم باتیں کرتے جا رہے تھے۔ اُن لوگوں نے مجھے بتایا کہ بادشاہ سلامت ہمارے اور عوام کیساتھ بہت مہربان ہیں۔ بادشاہ سلامت کے اچھے رویے کی وجہ سے لوگ اُن سے بہت محبت کرتے ہیں۔ آخر کار ہم شہر پہنچ گئے اور بادشاہ کے ملازمین نے میری ساری کہانی اُن کے گوشگوار کر دی۔ بادشاہ نے مجھے طلب کیا اور نہایت توجہ سے میری داستان سنی اور ملازمین کو حکم دیا کہ مجھے نیا لباس پہنائیں اور خصوصی طور پر میری خاطر داری کریں۔ بادشاہ کے حکم کے مطابق انہوں نے میری توقع سے بھی بڑھ کر میری مہمانداری کی۔ چند روز میں بادشاہ سلامت کا مجھ پر اعتماد قائم ہو گیا تو انہوں نے مجھے بندرگاہ اور جہاز رانی کا مشیر مقرر کر لیا۔ میرا کام بندرگاہ جا کر جہازوں کے عملے سے رابطہ رکھنا اور شہر میں تاجروں سے مل کر اُن کے احوال معلوم کر کے بادشاہ تک پہنچانا ہوتا تھا۔ یہ عہدہ میرے لئے بڑا اعزاز تھا اور میرا جہازوں کے عملے سے رابطہ بھی ہو جاتا تھا۔

ایک دن ایک بڑا جہاز نگر انداز ہوا تو میری تاجروں اور جہاز کے عملے سے ملاقات ہوئی۔ میں نے کپتان سے پوچھا کہ کیا جہاز سے سارا سامان تجارت نکال لیا گیا ہے۔ کپتان نے بتایا کہ جہاز سے تمام سامان نکال لیا گیا ہے، مگر چند ایک صندوق اندر پڑے ہوئے ہیں۔ یہ ایک نوجوان کے ہیں جو ایک حادثے میں شائد ہلاک ہو گیا۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ اُس کا مال و اسباب بچ کر رقم بغداد لے جاؤں اور اُس کے ورثا کو تلاش کر کے یہ رقم اُن کے سپرد کر دوں۔

کپتان کی بات سُن کر میں نے اُسے پہچان لیا اور پوچھا کہ اُس مسافر کا نام کیا تھا؟

کپتان بولا: سندباد۔

اپنا نام سُن کر میں سکتے میں آگیا اور پوری قوت سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ کپتان حیران ہو کر میرا منہ دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا: دوست میں ہی سندباد ہوں۔ میں ایمانداری سے سامان کی حفاظت کرنے پر تمہارا شکر گزار ہوں۔

کپتان بولا: مجھے تم بھلے آدمی لگتے ہو، لیکن میں یہ کیسے مان لوں کہ تم ہی سندباد ہو، جبکہ سندباد تو ہماری آنکھوں کے سامنے سمندر میں ڈوب گیا تھا۔ جہاز کے ملاح اور سب تاجر میری اس بات کی گواہی دیں گے۔

میں نے کہا: میرے دوست! میں تجھے جہاز پر اور سمندر میں ڈوبنے کے تمام حالات بتاتا ہوں، پھر تم خود ہی فیصلہ کر لینا کہ میں ہی سندباد ہوں یا نہیں۔ یہ کہہ کر میں نے بصرہ سے جہاز کے چلنے سے لیکر جزیرے کے سمندر میں ڈوبنے تک کے تمام حالات بتا دیئے اور پھر بعد میں پیش آنیوالے حالات سے بھی آگاہ کیا۔

کپتان بولا: ہم سب کو یقین تھا کہ تم سمندر میں ڈوب کر مر چکے ہو، مگر اللہ بڑا مہربان اور رحیم ہے۔ آج تمہیں نظروں کے سامنے پا کر ہمارا اللہ پر یقین

اور بھی مضبوط ہو گیا ہے۔ تمہاری کہانی سن کر شک کی کوئی گنجائش نہیں، یہ کہہ کر کپتان نے میرا مال مجھے لوٹا دیا۔ میں نے شہر میں اپنا مال اچھے داموں میں فروخت کر دیا اور بادشاہ کیلئے ایک عمدہ تحفہ لیکر دربار میں پہنچ گیا۔ بادشاہ میرا تحفہ دیکھ کر حیران ہوا۔ میں نے جہاز کے کپتان سے ملاقات اور اُس کی ایمانداری کے تمام احوال بادشاہ سلامت کو سنائے۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور اُس نے مجھے بہت سے قیمتی تحائف دیئے۔

کچھ روز بعد جہاز بغداد جانے کیلئے تیار کھڑا تھا۔ میں بادشاہ سلامت سے الوداعی ملاقات کیلئے گیا۔ میں نے بتایا کہ میں اُن کی مہربانیوں کو کبھی نہیں بھلا سکتا۔ آپ کی مہربانیاں اور شہر کی خوبصورتی کو دیکھ کر جانے کو دل تو نہیں چاہتا مگر میرے اپنے وطن میں میرے دوست و احباب اور عزیز واقارب میرے منتظر ہوں گے۔ میں چاہوں گا کہ آپ مجھے بخوشی اجازت دیجئے۔

بادشاہ میرے خلوص سے بہت خوش ہوا اور مجھے سونے، چاندی، جواہرات، قیمتی لباس اور بہت سے دوسرے قیمتی تحائف دیئے۔ ہمارا جہاز کئی روز کی طویل مسافت کے بعد آخر کار بغداد پہنچ گیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد اپنے دوست و احباب اور عزیز واقارب سے مل کر بہت خوشی ہوئی، مگر میں بہت سی حسین یادیں بادشاہ کے دیس میں چھوڑ آیا۔

متقی حکمران سلطان شمس الدین التمش

جب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی تو کھرام مچ گیا۔

جنازہ تیار ہوا، ایک بڑے میدان میں لایا گیا۔ بے پناہ لوگ نماز جنازہ پڑھنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔

انسانوں کا ایک سمندر تھا جو حدِ نگاہ تک نظر آتا تھا۔

جب جنازہ پڑھنے کا وقت آیا تو ایک آدمی آگے بڑھا اور کہنے لگا کہ میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کا وکیل ہوں۔

حضرت نے ایک وصیت کی تھی اور میں وہ وصیت آپ لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ وکیل کی بات سُن کر مجمعے پر سناٹا چھا گیا۔

وکیل نے پکار کر کہا۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی وصیت یہ ہے کہ میرا جنازہ وہ شخص پڑھائے جو ان خوبیوں کا مالک ہو۔ یہ کہ:

زندگی میں اس کی تکبیر اولیٰ کبھی قضا نہ ہوئی ہو۔

اس کی تہجد کی نماز کبھی قضا نہ ہوئی ہو۔

اس نے کبھی بغیر وضو کے آسمان کو نہ دیکھا ہو۔

اتنا عبادت گزار ہو کہ اس نے عصر کی سنتیں بھی کبھی نہ چھوڑی ہوں۔

جس شخص میں یہ خوبیاں ہوں وہ میرا جنازہ پڑھائے۔

جب یہ بات سنائی گئی تو مجمعے پر ایسا سناٹا چھایا کہ جیسے مجمعے کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

کافی دیر گزر گئی، کوئی نہ آگے بڑھا۔

آخر کار ایک شخص روتے ہوئے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے جنازے کے قریب آئے۔

جنازہ سے چادر اٹھائی اور کہا۔

حضرت یہ آپ نے کیا کیا؟ آپ نے تو دنیا سے پردہ فرمالیا مگر مجھے بے پردہ کر دیا۔

اس کے بعد بھرے مجمعے کے سامنے اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر قسم اٹھائی کہ میرے اندر یہ چاروں خوبیاں موجود ہیں۔

یہ شخص وقت کے بادشاہ سلطان شمس الدین التمش رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ اللہ اکبر!!

ہلاکو خان کی بیٹی کا سوال اور عالم کا جواب

ہلاکو خان نے 1258ء میں عراق پر ایک بڑا شدید حملہ کیا۔ اُس وقت بنو عباس کے آخری خلیفہ مستعصم باللہ کی خلافت کا دور تھا۔ مسلمان منظم ہو کر مقابلہ کرنے میں ناکام رہے اور تاتاریوں نے بصرہ، کوفہ اور بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔ بغداد میں مسلمانوں کی لائبریریوں سے قیمتی کتابوں کو اٹھوا کر دریائے دجلہ میں پھینکوا دیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بغداد کی گلیاں مسلمانوں کے خون سے سُرخ اور دریائے دجلہ کا پانی کتابوں کی سیاہی سے سیاہ ہو گیا تھا۔

ہلاکو خان کی بیٹی اپنے تاتاری محافظوں کیساتھ بغداد کی گلیوں میں گشت کر رہی تھی کہ اُس نے ایک جگہ ہجوم کو دیکھا تو پوچھا کہ لوگ یہاں پر اکٹھے کیوں ہیں؟

کسی نے جواب دیا کہ یہ لوگ ایک عالم کے پاس کھڑے ہیں۔

ہلاکو خان کی بیٹی نے تاتاری محافظوں کو حکم دیا کہ اس عالم کو میرے سامنے پیش کیا جائے۔ چنانچہ تاتاریوں نے عالم کو پکڑ کر ہلاکو خان کی بیٹی کے سامنے لا حاضر کیا۔

تاتاری شہزادی نے عالم سے پوچھا: کیا تم لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہو؟

عالم نے جواب دیا: یقیناً ہم ایمان رکھتے ہیں۔

تاتاری شہزادی بولی: کیا یہ تمہارا ایمان نہیں ہے کہ اللہ جسے چاہے غالب کر دے؟

عالم نے جواب دیا: یقیناً ہمارا اس بات پر ایمان ہے۔

تاتاری شہزادی بولی: تو کیا اللہ نے آج ہمیں تم لوگوں پر غالب نہیں کر دیا؟

عالم نے جواب دیا: یقیناً کر دیا ہے۔

تاتاری شہزادی بولی: تو کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اللہ ہمیں تم سے زیادہ چاہتا ہے؟

عالم بولا: بالکل نہیں۔

تاتاری شہزادی بولی: وہ کیسے؟

عالم بولا: کبھی تم نے چرواہے کو ریوڑ کیساتھ دیکھا ہے؟

تاتاری شہزادی بولی: ہاں دیکھا ہے۔

عالم بولا: پھر تو تم نے وہ کتے بھی دیکھے ہونگے جو چرواہا ریوڑ کیساتھ لئے پھر رہا ہوتا ہے؟
تاتاری شہزادی بولی: ہاں میں نے دیکھے ہیں۔

عالم بولا: اچھا تم یہ بتاؤ کہ اگر کچھ بھیڑیں ریوڑ سے باہر نکل جائیں اور چرواہے کی آواز پر واپس نہ لوٹیں تو چرواہا کیا کرتا ہے؟
تاتاری شہزادی بولی: چرواہا اُن کے پیچھے اپنے کتے دوڑاتا ہے تاکہ اُنہیں ریوڑ میں واپس لے آئیں۔
عالم بولا: وہ کتے کب تک بھیڑوں کی پیچھے پڑے رہتے ہیں؟

تاتاری شہزادی بولی: جب تک وہ بھیڑوں کو چرواہے کے ریوڑ میں واپس نہیں لے آتے۔
عالم بولا: تم تاتاری لوگ زمین پر ہم مسلمانوں کے پیچھے چھوڑے ہوئے خدا کے کتے ہو۔ جب تک ہم خدا سے دور بھاگتے رہیں گے اور اُسکی اطاعت قبول نہیں کریں گے، وہ تمہیں ہم پر چھوڑے رکھے گا اور تم لوگ ہمارا امن چین برباد کرتے رہو گے اور جس دن ہم نے اللہ کی اطاعت اپنے اوپر لازم کر لی، اُس دن تمہارا کام ختم ہو جائیگا۔

کیا عالم کے جواب میں ہم آج کے مسلمانوں کیلئے کوئی راہِ ہدایت ہے؟ ذرا سوچیے تو!

جب جزائرِ مالدیپ میں اسلام کا سُورج چمکا

ابن بطوطہ ایک مشہور مسلمان سیاح تھا۔ اُس کے نام کے بغیر سیاحت کا ذکر بے معنی ہے۔ اپنے سفر نامے میں وہ لکھتے ہیں: جب میں 1314ء میں سیاحت کا سفر طے کرتے ہوئے جزائرِ مالدیپ پہنچا تو میں نے دیکھا کہ سارا ملک اذان کی صداؤں سے گونج رہا ہے۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کیونکہ میرے علم کے مطابق کوئی مسلمان تاجر سپہ سالار فاتحانہ انداز میں جزائرِ مالدیپ نہیں آیا تھا۔ تو پھر یہ سرزمین اسلام کے نور سے کیسے منور ہوئی؟ میں نے یہ سوال وہاں کے اہل علم و دانش سے کیا تو انہوں نے بتایا:

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک عرب جہاز کچھ تجارتی سامان لیکر مشرقِ اقصیٰ کی جانب جا رہا تھا۔ جب یہ جہاز مشرقی جزائر کے قریب سے گذر رہا تھا تو ایک سمندری طوفان کی لپیٹ میں آگیا۔ جہاز توتباہ ہو گیا مگر ایک مراکشی عرب تاجر ایک تختے پر بیٹھ کر کنارے آگیا۔ وہ چلتا ہوا آبادی کی طرف بڑھا تو ایک گھر پر دستک دی وہاں بڑھیا اپنی نوجوان بیٹی کیساتھ رہتی تھی۔ اجنبی کی داستان سن کر بڑھیا نے اُسے اپنے گھر میں پناہ دیدی۔ عرب تاجر کو پناہ ملی تو اُس نے لکڑیاں کاٹنے کا کام شروع کر دیا۔ اس کام سے اُس کی گذر اوقات ہونے لگی۔

ایک دن عرب اجنبی جب کام سے گھر واپس آیا تو دیکھا کہ بڑھیا رو رہی ہے اور اُس کی بیٹی پاس ہی بیٹھی اپنا سر پیٹ رہی ہے۔ عرب نے پوچھا: یہ کیا معاملہ ہے؟

بڑھیا بولی: آج میرے بڑھاپے کا سہارا میری اکلوتی بیٹی مر جائیگی۔

عرب بولا: مگر کیسے؟ یہ تو تندرست ہے اور پھر غیب کی باتیں تو اللہ ہی جانتا ہے۔

بڑھیا فوجی سواروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی: وہ سامنے دیکھو، موت کھڑی ہے۔

عرب نے پوچھا: کیا یہ تمہاری بیٹی کو قتل کرنے آئے ہیں؟

بڑھیا بولی: یہ میری بیٹی کو لینے آئے ہیں اور پھر یہ لے جا کر اسے موت کے حوالے کر دیں گے۔

عرب بولا: آخر قتل کرنے کی کوئی وجہ تو ہوگی؟

بڑھیا بولی: ہمارے جزیرہ میں ہر ماہ ایک مقررہ تاریخ کو سمندر کے اندر سے ایک بلا نمودار ہوتی ہے، جس سے بچنے کیلئے ہم جزیرہ والے لوگ غروبِ

آفتاب کے بعد ایک کنواری لڑکی کو سمندر کے کنارے مندر میں پہنچا دیتے ہیں۔ جو اگلی صبح ہمیں سمندر کے کنارے مردہ حالت میں ملتی ہے اور اُس

کی دوشیزگی ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ لڑکی کا انتخاب ہر مرتبہ قرعہ اندازی سے کیا جاتا ہے۔ اس سال قرعہ میری لڑکی کے نام نکلا ہے۔ لڑکی میری اکلوتی

اولاد اور بڑھاپے کا سہارا ہے اور میں اس کے چھن جانے کی وجہ سے رو رہی ہوں۔

عرب بڑھیا کی دردناک کہانی سن کر بولا: تم تسلی رکھو۔ میں اس سمندری بلا کا علاج جانتا ہوں۔ یہ خبیث جنات ہیں اور میں تم لوگوں کو ان سے چھٹکارا دلا دوں گا۔ تم ایسا کرو کہ مجھے لڑکی کا لباس پہنا کر سپاہیوں کے حوالے کر دینا، پھر میں تم لوگوں کی نجات کیلئے کچھ کروں گا۔ بڑھیا نے ایسا ہی کیا۔ سپاہی آئے اور اُسے لیکر سمندر کے کنارے چھوڑ آئے۔

اس عرب کا نام ابوالبرکات تھا اور یہ حافظِ قرآن تھا۔ سپاہیوں کے چلے جانے کے بعد انہوں نے اطمینان سے وضو کیا، عشاء کی نماز پڑھی اور ننگی تلوار سامنے رکھ کر سمندر کی لہروں کی جانب دیکھنے لگے اور ساتھ ہی قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دی۔

یہ رات انتہائی خوفناک اور اندھیرہ بڑا گھمبیر تھا۔ جزائرِ مالدیپ میں بسنے والے نیند کی وادیوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ صرف تین لوگ ایسے تھے کہ جن آنکھوں سے نیند کو سوں دور تھی۔ ایک مراکشی غریب الوطن ابوالبرکات جو سمندری بلا سے جزائرِ مالدیپ کے لوگوں کی جان چھڑانے کیلئے اللہ رب العزت کے سامنے دُعا گو تھا۔ دوسری بڑھیا جو اپنی بیٹی کی جان بچ جانے پر خوش ہونے کی بجائے مراکشی غریب الوطن ابوالبرکات کیلئے غزدہ تھی کہ نجانے اُس کیساتھ کیا ہو گا۔ اور وہ معصوم لڑکی مراکشی غریب الوطن ابوالبرکات کیلئے روئے جا رہی تھی۔

مراکشی غریب الوطن ابوالبرکات سمندر کے کنارے بیٹھا قرآن پاک کی تلاوت کئے جا رہا تھا۔ آدھی رات بیت چکی تھی کہ اچانک وہ سمندری بلا نمودار ہوئی۔ یہ بحری جہاز کی شکل کی خوفناک چیز تھی، جس میں میٹھا خانے بنے ہوئے تھے۔ یہ خوفناک عفریت آہستہ آہستہ کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ابوالبرکات نے قرآن پاک کی تلاوت جاری رکھی۔ خوفناک عفریت مندر کے سامنے کنارے کے پاس آکر رُک گئی۔ تھوڑی دیر رُکنے کے بعد یہ خوفناک عفریت آہستہ آہستہ واپس چلتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

صُبح ہوئی تو سپاہی لڑکی کی لاش لینے کیلئے سمندر کے کنارے پہنچے تو وہاں لاش موجود نہ تھی، بلکہ قریب ہی مراکشی عرب کو موجود پایا۔ سپاہی اُسے راجہ کے پاس لے گئے اور ساری کہانی بیان کی۔ راجہ نے اپنی تسلی کیلئے مراکشی عرب سے کچھ سوال کئے اور پھر بڑھیا اور اُس کی بیٹی کو بلایا۔ بوڑھی عورت اور اُس کی بیٹی نے مراکشی عرب کے بتائے ہوئے تمام واقعات کی تصدیق کی۔ راجہ نے مراکشی عرب سے پوچھا: تم نے یہ خطرہ کیوں مول لیا؟

مراکشی عرب بولا: پہلی بات یہ کہ میں نے شریعتِ اسلامی کے مطابق ان کی مدد کی، کیونکہ اسلام ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں جب یہاں پہنچا تھا تو میرا سب کچھ سمندر کی نذر ہو چکا تھا اور میں بے یار و مددگار تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے گھر میں پناہ دی۔ میں شائد کبھی بھی یہ احسان نہ چکا سکوں مگر ان کی مدد کر کے میں نے اُس احسان کا معمولی سا بدلہ چکا یا ہے۔

راجہ مراکشی عرب کی باتوں سے بڑا متاثر ہوا اور کہنے لگا: تم تنہا اتنی بڑی بلا کے سامنے جا کھڑے ہوئے، کیا تمہیں ڈر نہیں لگا؟

مراکشی عرب بولا: مجھ میں تنہا اتنی بڑی عفریت سے ٹکرانے کی ہمت کہاں؟ میرا اللہ میرے ساتھ تھا، اُسی کی مدد سے یہ سب ممکن ہوا۔

راجہ بولا: تم اُس خوفناک عفریت ڈرے کیوں نہیں؟

مراکشی عرب بولا: مسلمان اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔

راجہ کہنے لگا: اے بہادر شخص! اگر تم اگلی مرتبہ بھی اکیلے گئے اور خیریت سے واپس لوٹے تو ہم سب اسلام کی صداقت کے آگے سر جھکالیں گے۔ اہل دربار نے بھی تائید کرتے ہوئے کہا: ہم سب راجہ کے قول پر قائم رہیں گے۔

چنانچہ اگلے مہینے جب مقررہ تاریخ آئی تو مراکشی عرب اکیلے ہی سمندر کے کنارے مندر کے پاس چلا گیا اور حسبِ سابق قرآن کی تلاوت کرتا رہا۔ اس دفعہ سمندری عفریت نمودار نہیں ہوئی۔ صبح ہوئی تو بہادر مراکشی عرب واپس آگیا۔ راجہ کو خبر ملی تو اُس نے اپنی رعایا کو بتایا کہ اس بہادر مسلمان کیوجہ سے ہمیں ہمیں سمندری بلا سے ہمیشہ کیلئے نجات مل گئی ہے۔ جزائرِ مالدیپ پر اسلام کی صداقت کا شور مچ گیا۔ پہلے تو بڑھیا اور اُس کی بیٹی مسلمان ہوئے اور پھر پورا جزائرِ مالدیپ کلمہ شہادت "أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ" کی پکار سے گونج اٹھا۔

حاکم وقت انصاف کی عدالت میں

سلطان غیاث الدین کا دور حکمرانی (1366ء تا 1377ء) بنگال کی مسلم سلطنت کا سنہری دور تھا۔ سلطنت میں ہر طرح امن و امان اور خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ سلطان غیاث الدین ایک اعلیٰ پایہ کا منتظم، باعمل عامل اور زاہد و حکمران تھا۔ سلطان امورِ مملکت اور مذہبی فرائض کی مصروفیت کے باوجود سلطنت کے دفاع سے ہرگز غافل نہ تھا۔ وہ فوج کو ہر وقت جنگی مشقوں میں مصروف رکھتا تھا۔ ایک دن تیز اندازی کی مشق ہو رہی تھی۔ سلطان غیاث الدین بھی اپنے سپاہیوں کے ساتھ تیز اندازی میں مشغول تھا۔ سلطان نے نشانہ باندھ کر کئی تیر چھوڑے، ناگاہ ایک تیر کا نشانہ خطا ہو گیا اور یہ ترتیبی احاطے سے باہر چلا گیا۔

اتفاق سے یہ تیر ایک غریب عورت کے بچے کو لگا اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا۔ سلطان کو اس حادثے کی خبر نہ ہوئی۔ اور وہ مشق مکمل ہونے کے بعد تھکا ماندہ اپنے عملے کے ساتھ قصر شاہی کی طرف کوچ کر گیا۔ قاضی سراج الدین دن بھر کے عدالتی کام کو سمیٹ کر اٹھنے ہی والے تھے کہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے ایک کمزور خاتون حاضر ہو گئی اور قاضی صاحب سے فریاد کی کہ قاضی صاحب! میں ایک بیوہ ہوں اور میرا بچہ اس تیر سے موت کے منہ میں چلا گیا۔ میں آپ سے انصاف کی طالب ہوں۔ یہ کہہ کر عورت نے تیر قاضی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

قاضی سراج الدین نے عورت کا دیا ہوا تیر دیکھا اور سوچ میں پڑ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں شاہی تیر تھا جسے صرف سلطان ہی استعمال کرتا تھا۔ قاضی صاحب کچھ دیر کسی سوچ میں پڑ گئے اور پھر ایک درہ مسند قضا کے نیچے چھپا کر رکھ دیا۔ جوابِ دعویٰ کے ساتھ حاضر ہونے کے لئے سلطان کے نام سمن جاری کر دیا۔ عدالت کے حکم کی تعمیل کرانے کے لئے ایک پیادے کو روانہ کر دیا۔ پیادہ قصر شاہی کے حدود میں داخل ہوا تو اس کو اندازہ ہوا کہ بے پناہ مصروفیت کے باعث اس وقت بادشاہ تک رسائی آسان نہیں ہے۔

پیادے نے بلند آواز سے اذان دینی شروع کر دی۔ بے وقت اذان سن کر بادشاہ نے موذن کو دربار میں پیش کرنے کا حکم دیا۔ موذن کو حاضر کیا گیا تو بادشاہ نے بے وقت اذان کی وجہ دریافت کی۔ پیادے نے عدالت کا پروانہ پیش کر دیا اور کہا! مجھے سلطان کو محکمہ عدلیہ میں حاضر کرنے کا حکم ملا ہے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ قصر شاہی کا عملہ اس وقت سلطان تک رسائی نہ دے گا، اس لئے یہ حیلہ اختیار کیا۔ سلطان فوراً اٹھا ایک چھوٹی سی تلوار بغل میں چھپا کر عدالت کی طرف چل پڑا۔

قاضی سراج الدین کے سامنے پیش ہوا، قاضی صاحب نے تعظیم تو کجا سلطان کی طرف التفات تک نہ کیا۔ جیسے کہ اس کو جانتے ہی نہ تھے۔ فریقین کے بیان لئے اور فیصلہ صادر کیا۔ سلطان غیاث الدین پر قتل کا جرم ثابت ہو گیا، از روئے قانون شریعت سلطان کو قصاص میں قتل کرنے کی سزا سنائی جاتی ہے۔ البتہ سلطان کو موت وزیست کا فیصلہ مستغثہ کی مرضی پر منحصر ہے۔

سلطان غیاث الدین نے ملزموں کے کٹہرے میں اپنے خلاف سنائی گئی سزائے موت کو سر جھکائے تسلیم کیا۔ یہ منظر دیدنی تھا، سلطان ایک لاچار ملزم کی حیثیت سے محکمہ عدلیہ میں اس پرندے کی طرح بے یار و مددگار تھا جسے ذبح کرنے کی غرض سے کسی پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ مستغثہ ممنا کی ٹیس کی وجہ سے سلطان پر خشمگیں نظریں گاڑی ہوئی تھی۔ سب کو لگا کہ سلطان اب تھوڑی دیر کا مہمان ہے اور جرم کی پاداش میں اس پر حد شرعی لاگو ہونیوالی ہے۔

ادھر قاضی صاحب فیصلہ سنانے کے بعد اس انتظار میں تھے کہ اگر فریقین کے بیچ شریعت میں دی گئی رعایت کے پیش نظر کوئی سمجھوتہ ہوتا ہے تو ٹھیک نہیں تو سورج ڈوبنے سے پہلے سلطان کو جلا دے حوالے کر دیا جائے۔ سلطان کی لاچاری اور کسمپرسی کو دیکھ کر یکایک خاتون کا دل بھر آیا اور اس نے خون بہا کے عوض سلطان کو موت کے بے رحم شکنجے سے چھڑانے کا فیصلہ کیا۔ قاضی صاحب کو اطلاع دی گئی کہ مستغثہ سلطان کی جان بخشی کے لئے تیار ہو گئی ہے۔

قاضی صاحب نے مستغثہ سے پوچھا ”کیا تو راضی ہو گئی؟“ جواب ملا ”سلطان کی لاچاری دیکھ کر میں نے اس کی جان بخشی کا فیصلہ کر لیا۔“ پھر دریافت کیا ”کیا اس عدالت سے تو نے داد پائی؟“ مستغثہ نے جواب دیا ”قاضی صاحب میں آپ کی عدالت سے بھرپور داد پائی۔“ مقدمے سے فراغت کے بعد قاضی سراج الدین نے خندہ پیشانی سے سلطان کی تعظیم کی اور اس کو مسند پر بٹھایا۔

سلطان نے بغل میں چھپائی ہوئی تلوار نکالی اور بولا ”قاضی صاحب میں شریعت کی پابندی کی خاطر آپ کے پاس حاضر ہوا۔ اگر آپ قانون شریعت کی خلاف ورزی کرتے تو اس تلوار سے آپ کی گردن اڑا دیتا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے منصب قضا کا پورا حق ادا کر دیا۔“ قاضی سراج الدین نے مسند کے نیچے چھپایا ہوا دُرہ نکالا اور فرمایا ”اے سلطان! اگر آج آپ شریعت کی حد سے ذرا بھی تجاوز کرتے تو اس دُرے سے آپ کی کھال اتار دیتا.... آج ہم دونوں کے امتحان کا دن تھا۔“

امیر البحر خیر الدین پاشا باربروسا

سلطنتِ عثمانیہ کا دورِ خلافت تھا۔ 1478ء میں یونان کے جزیرہ ڈیلیلی میں یعقوب آغا کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا (ڈیلیلی کا موجودہ نام لزبوس ہے) بچے کا نام خضر ابن یعقوب رکھا گیا۔ ماں کا نام قطرینہ تھا جو ایک عیسائی عورت تھی۔ خضر بن یعقوب کے تین اور بھائی اسحاق، عروج اور الیاس تھے۔ چاروں بھائی عثمانی فوج میں سپاہی تھے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے جہاز رانی سیکھ لی اور پھر ایک بحری بیڑہ بنا کر رہوڈس اور سینٹ جونز سے آنے والے جہازوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ اسی کشمکش میں اُس کا بھائی الیاس مارا گیا اور عروج گرفتار ہو گیا۔ کچھ عرصہ اُسے رہوڈس میں قید رکھا گیا اور پھر غلام بنا کر فروخت کر دیا گیا۔ عروج فرار ہو کر اٹلی سے ہوتا ہوا مصر پہنچ گیا اور مملوک سلطان قانصوہ غوری سے ملنے میں کامیاب ہو گیا۔ قانصوہ غوری نے عروج کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر بحری جہاز کا کمانڈر بنا دیا اور عیسائیوں کے زیر قبضہ بحیرہ روم کے جزائر پر حملہ کرنے کیلئے بھیجا۔

1505ء میں عروج نے تین اور بحری بیڑے حاصل کر کے جبرنامی جزیرے پر اپنا بحری اڈہ بلکہ چھاؤنی بنالی۔ سقوطِ غرناطہ کے بعد جب عیسائیوں نے اسپین سے مسلمانوں کو نکالا تو عروج نے اپنے بحری بیڑے کی مدد سے انہیں الجزائرہ شمالی افریقہ پہنچایا۔ ہسپانوی (اسپین) مسلمان عروج کے حُسنِ سلوک سے بہت متاثر ہوئے اور پیار سے اُسے عروج بابا کہنے لگے۔ اسپین اٹلی اور فرانس میں زبان کے تلفظ کی وجہ سے اُسے باربروسا کہا جانے لگا۔ باربروسا جانتا تھا کہ الجزائرہ زیادہ دیر اسپین کی زد میں آنے سے بچ نہیں سکے گا اس لئے اُس نے عثمانی سلطان کو مشورہ دیا کہ وہ الجزائرہ کو سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کر لے۔ چنانچہ عثمانی سلطان نے باربروسا کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے الجزائرہ کو سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کر لیا اور باربروسا کو پاشائے الجزائرہ اور مغربی بحیرہ روم میں بحری فوج کا کمانڈر مقرر کر دیا۔ الجزائرہ کا حاکم مقرر ہوتے ہی باربروسا نے ارد گرد کے علاقوں پر قبضہ کر کے الجزائرہ کی ریاست میں شامل کرنا شروع کر دیا۔ 1518ء میں ہسپانوی فوجوں کیساتھ جنگ میں اپنے بھائی اسحاق سمیت شہید ہو گیا۔

خیر الدین جو اپنے بھائی کے بحری بیڑے میں شامل تھا۔ اُس نے بیڑے کی کمان سنبھال لی اور اپنے بھائی کے کاموں کو متواتر جاری رکھا۔ وہ اسپین سے مسلمانوں کو نکال کر الجزائرہ پہنچاتا رہا۔ 1519ء میں اسپین نے اٹلی سے فوجی اشتراک کر کے الجزائرہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر خیر الدین باربروسا نے انہیں شکستِ فاش دی اور اپنے بھائی کے مشن کو جاری رکھا۔ ہسپانوی فوجیں خیر الدین باربروسا کو زیر کرنے کیلئے چھیڑ چھاڑ کرتی رہتی تھیں۔ 1529ء میں خیر الدین باربروسا نے انہیں سبق سکھانے کیلئے اسپین کے ایک ساحلی جزیرے اور قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اسپین کیلئے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ انہوں نے اینڈریا ڈوریانا می شخص کو عہدوں اور انعامات کا لالچ دیا اور وچ کا کمانڈر مقرر کر باربروسا کی سرکوبی کیلئے بھیجا۔ کمانڈر اینڈریا ڈوریا کے دل میں باربروسا کی اتنی دہشت تھی کہ وہ باربروسا کے بحری بیڑے کے آنے کی خبر سن کر بھاگ گیا۔

1532ء میں سلطنتِ عثمانیہ کے سلطان سلیمان اعظم (سلیمان قانونی) نے اپنا بحری بیڑہ تشکیل دینے کا فیصلہ کیا تو اُس کی نظر باربروسا پر پڑی۔ سلطان

سلیمان اعظم نے باربروسا کو استنبول طلب کیا اور اُسے بحیرہ روم اور شمالی افریقہ میں بحری فوج کا امیر البحر مقرر کرتے ہوئے کمان اُس کے سپرد کی۔ اُس دور میں امیر البحر کو "پاشا" کہا جاتا تھا۔ اسی لئے وہ تاریخ میں خیر الدین پاشا باربروسہ کے نام سے مشہور ہوا۔

خیر الدین باربروسا نے بحری کمان سنبھالتے ہی اٹلی کے جنوبی ساحلی علاقوں پر حملے شروع کر دیے۔ 1534ء میں تیونس پر قبضہ کر لیا، تیونس کا حفصی سلطان مولائے حسن فرار ہو گیا اور اپنی سلطنت کے دوبارہ حصول کیلئے چارلس پنجم سے مدد کی درخواست کی۔ 1535ء میں سلطان مولائے حسن نے اسپین اور فرانس کی فوجوں کیساتھ ملکر باربروسا سے جنگ کرتے ہوئے تیونس، بونے اور مہدیہ پر قبضہ کر لیا۔

خیر الدین باربروسا اپنی شکست کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اُس نے عثمانی فوجوں کیساتھ ملکر زبردست تیاری کی۔ 1537ء میں باربروسا نے جزائر آیونین اور اور جنوبی اٹلی پر حملہ کر دیا اور سلطنت وینس سے کورفو کا علاقہ چھین لیا۔ اٹلی اپنی شکست کا داغ مٹانا چاہتا تھا چنانچہ 1538ء میں پال پاپ سوم نے پاپائے روم، رومی سلطنت، اسپین، وینس اور مالٹا کی افواج کو ملا کر کمان اینڈریا ڈوریا کے سپرد کر دی۔ یاد رہے کہ اینڈریا ڈوریا پہلے بھی باربروسا سے جنگ کئے بغیر بھاگ گیا تھا۔ بہر حال "پریویزا" کے مقام پر دونوں افواج میں جنگ ہوئی۔ باربروسا نے عیسائی اتحادی فوج کو زبردست شکست دی۔ اس شاندار فتح کی بدولت بحیرہ روم تینتیس سال تک ترکوں کے قبضے میں رہا۔

خیر الدین باربروسا نے اگلے سال کا سل نوو بھی اٹلی سے چھین لیا اور باقی ماندہ بحری ٹھکانوں کو تباہ کر دیا۔ 1540ء میں وینس کی حکومت نے گھٹنے ٹیکتے ہوئے سلطان سلیمان اعظم سے امن معاہدہ کر لیا۔ عیسائی زیادہ دیر تک معاہدے پر قائم نہ رہے اور 1541ء میں چارلس پنجم نے الجزائرہ کا محاصرہ کر کے بحیرہ روم پر سلطنت عثمانیہ کا تسلط ختم کرنا چاہا مگر ٹکراؤ سے پہلے ہی اُسے زبردست سمندری طوفان کے سبب بھاگنا پڑا۔ چارلس پنجم کی فوج کا کچھ حصہ ساحل پر اترنے میں کامیاب ہوا جسے باربروسہ کی زمینی فوج نے وہیں پر روک دیا۔ سمندری طوفان کی وجہ سے جب چارلس پنجم کے بحری بیڑے نے واپسی کیلئے رخ موڑا تو اُس کے فوجی بھی بھاگ کر سوار ہو گئے۔

1543ء میں باربروسہ اسپین اور اٹلی کے ساحلی جزائر پر حملے کرتا ہوا فرانس کے ساحلوں تک جا پہنچا اور فرانس کے ساحلی شہر "نیمس" پر قبضہ کر لیا۔ باربروسہ کے تابڑ توڑ حملوں سے پریشان ہو کر اسپین اور اٹلی کے بحری بیڑے نے جوابی حملہ کیا مگر زبردست شکست کھا کر پسپا ہو گئے۔ خیر الدین باربروسہ کے بحری بیڑے کو ناقابل شکست جان کر 1544ء میں چارلس پنجم سلطنت عثمانیہ سے امن معاہدہ کرنے کیلئے استنبول پہنچ گیا۔

خیر الدین باربروسہ 1544ء میں استنبول پہنچا اور سلطان سلیمان اعظم سے اپنی سبکدوشی کی درخواست کی۔ سلطان سلیمان اعظم نے اُس کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے سبکدوش کر دیا۔ اور الجزائرہ میں خیر الدین باربروسہ کے بیٹے حسن پاشا کو نیا امیر البحر مقرر کر دیا۔

خیر الدین پاشا باربروسہ سبکدوشی کے بعد آبنائے باسفورس کے کنارے واقع اپنے محل میں چلا گیا۔ وہیں پر اُس نے اپنی سوانح حیات "غزوات خیر الدین پاشا" لکھی، جو ہاتھ سے لکھی گئی پانچ جلدوں پر مشتمل ہے اور یہ کتاب جامع استنبول کے توپ کا پی عجائب گھر میں محفوظ ہے۔



استنبول کے بحری عجائب گھر کے قریب باربروسہ کا مجسمہ

خیر الدین پاشاہ باربروسہ کا انتقال 1546ء میں ہوا اور محل کے پاس ہے مقبرہ بنایا گیا۔ خیر الدین پاشاہ باربروسہ کی خدمات کے اعتراف میں رہائش گاہ کے قریب واقع بحری عجائب گھر کے پاس اُن کا مجسمہ نسب کیا گیا ہے۔ خیر الدین پاشاہ باربروسہ کو ترکی کے بانیوں میں سمجھا جاتا ہے۔ ترک بحریہ کے جہازوں کے نام اُس کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ آبنائے باسفورس سے گزرنے والے ترک بحرے جہاز آج بھی اُس کے مقبرے کو سلامی دیتے ہوئے گزرتے ہیں۔

فرید خان شیر شاہ سُوری ایک ہیمنٹال ٹھکران



1486ء کا ذکر ہے کہ شمالی ہندوستان کے شہر جو پور میں کے پٹھان خاندان میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ اہل خانہ نے اُس کا نام فرید خان رکھا۔ شہر جو پور موجودہ ہندوستان کی ریاست اُتر پردیش میں واقع ایک تاریخی شہر ہے۔ کچھ تاریخ نویس کے مطابق اُس کی پیدائش سہرام میں ہوئی جو اُس وقت کے ضلع روہتاس میں واقع تھا۔ فرید خان کے والد حسن خان سُور افغانستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ وہ عہدِ بابر میں ایک معمولی جاگیردار تھے۔ اُن کی دیانت اور بہادری کو دیکھتے ہوئے والی جو پور امیر جمال خان نے حسن خان سُور کو پانچ سو سپاہیوں کا سالار مقرر کیا اور دو جاگیریں بھی عنایت کیں۔

فرید خان کے گھر میں اُس کے باپ کے علاوہ سوتیلی ماں اور بھائی تھے جو اُس پر ظلم کرتے تھے۔ فرید خان دلبر داشتہ ہو کر گھر سے بھاگ گیا اور ایک اصطبل میں نوکری کرنے لگا۔ اُس کا بچپن گھوڑوں کو چارہ ڈالنے اور نہلانے میں گزرا۔ وہ ایک باعزم اور بہادر بچہ تھا۔ ایک روز وہ ایک گھوڑے کو لیکر کہیں جا رہا تھا کہ وہاں سے مُغل بادشاہ ظہیر الدین بابر کا گُذر ہوا۔ بادشاہ نے بچے کی طرف دیکھا تو اُسے بچے کی پیشانی پر عجیب سی چمک نظر آئی تو اُس

نے کہا کہ یہ بچہ مجھے غیر معمولی لگتا ہے، یہ کہہ کر بابر نے ایک سکہ بچے کی جانب پھینکا اور چلا گیا۔ بچہ بڑا خوش تھا کہ آج اُس نے بادشاہ سلامت کو دیکھا ہے، اُس نے جھک کر سکہ اٹھایا اور خوشی خوشی اپنی منزل کی طرف چل دیا۔

فرید خان ذرا بڑا ہوا تو واپس اپنے والد کی جاگیر پر لوٹ گیا، کچھ عرصہ جاگیر کا انتظام چلایا اور اپنی بہترین صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے اپنے باپ کی جاگیر میں شامل زمینوں کو قابلِ کاشت بنایا۔ جاگیر کے انتظام کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ فرید خان مستقبل کی غیر معمولی شخصیت ہے۔ جاگیر کے لوگ فرید خان سے متاثر ہو کر اُس سے بہت محبت کرنے لگے تھے کیونکہ فرید خان کی بدولت اُن کھیتیاں ہری بھری ہو گئی تھیں اور وہ خوشحال ہو گئے تھے۔ جاگیر میں فرید خان کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو دیکھ کر سوتیلی ماں اُس کے باپ کو ورغلانے لگی۔ فرید خان اپنوں کی بے رُخیوں سے دلبرداشتہ ہو گیا اور اپنے سگے بھائی نظام کو لیکر گھر کو چھوڑ کر آگرہ چلا آیا۔ کچھ عرصہ بعد اُس نے اپنی قابلیت اور لیاقت کے بل بوتے پر اُس کو جنوبی بہار کے حاکم سلطان محمد کے پاس ملازمت کر لی۔ بہار اُس وقت ابراہیم لودھی کی حکومت میں شامل تھا اور وہ تقریباً آدھے ہندوستان پر حکومت کرتا تھا۔ ایک شکار کے موقع پر سلطان محمد پر شیر نے حملہ کر دیا تو فرید خان نے نہ صرف سلطان محمد کی جان بچائی، بلکہ مقابلہ کر کے شیر کو مار ڈالا۔ سلطان محمد نے فرید خان کی بہادری پر اُسے شیر شاہ کا خطاب دیا اور باپ کے نام کی مناسبت سے اُسے شیر شاہ سوری کہا جانے لگا۔

کچھ عرصہ شہنشاہ ظہیر الدین بابر کی ملازمت بھی کی اور اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر اُس کی قربت حاصل کر لی۔ ظہیر الدین بابر شیر شاہ سوری کی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوا اور اُسے مغلوں کے اقتدار کیلئے خطرہ محسوس کرنے لگا۔ شہنشاہ ظہیر الدین بابر نے اپنے کچھ لوگوں کو شیر شاہ سوری کی جاسوسی پر لگا دیا۔ شیر شاہ سوری بہت ہوشیار شخص تھا، وہ شہنشاہ ظہیر الدین بابر کی چال کو سمجھ گیا اور وہاں سے واپس اپنی جاگیر پر آ گیا۔

شیر شاہ سوری کچھ عرصہ اپنی جاگیر پر رہا۔ جاگیر کے لوگ اُسے بہت پسند کرتے تھے مگر سوتیلی ماں اور بھائیوں کی شدید مخالفت سے اکتا کر شیر شاہ سوری دوبارہ بہار کے حاکم سلطان محمد کے پاس چلا گیا۔ سلطان محمد بھی یہ جان چکا تھا کہ دشمنوں اور حاسدوں کے درمیان شیر شاہ سوری حقیقی ایک ہمدرد شخص ہے۔ اُس نے شیر شاہ سوری کو اُس کے عہدے پر بحال کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد سلطان محمد کا انتقال ہو گیا۔ اُس کا بیٹا جلال محمد خان ابھی کمسن تھا مگر اُسے حاکم بہار بنا دیا گیا۔ بہار کے ساتھ بنگال میں اُس وقت ابراہیم لودھی کا بھائی محمود لودھی حاکم تھا۔ بنگال کے بہار کیساتھ کافی اختلافات تھے۔ جلال محمد خان کو کمسن سمجھتے ہوئے محمود لودھی نے بہار پر لشکر کشی کر دی مگر شیر شاہ سوری نے بہار کی فوجوں کی کمان سنبھالتے ہوئے اُسے شکستِ فاش دی۔ محمود لودھی نے شیر شاہ سوری کو اپنی شکست کا ذمہ دار سمجھتے ہوئے جلال محمد خان سے مل کر اُس کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ شیر شاہ سوری نے محمود لودھی کی چال کو سمجھتے ہوئے بہار کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ جلد ہی اُس نے ایک مربوط اسلامی نظام قائم کرتے ہوئے آس پاس کے علاقوں کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔

شہنشاہ ظہیر الدین بابر کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا ہمایوں شہنشاہ بنا تو اُسے علم اور ستارہ شناسی میں زیادہ دلچسپی تھی۔ شیر شاہ سوری نے نظامِ سلطنت پر

ہمایوں کی گرفت ڈھیلی دیکھی تو قنوج اور بنگال کے علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ شیر شاہ سوری نے ایک لشکر ترتیب دیا اور مغل شہنشاہ ہمایوں سے جنگ کر کے اُسے شکست دی اور یوں شیر شاہ سوری مئی 1540 میں ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔

شیر شاہ سوری نے ہندوستان پر صرف پانچ سال حکومت کی، جبکہ مغلیہ خاندان ہندوستان پر تین سو اکتیس برس تک حکومت کرتا رہا۔ اگر ہم دونوں کا موازنہ کریں تو شیر شاہ سوری کا پانچ سالہ عہد حکومت مغلیہ دور سے کہیں زیادہ بہتر تھا۔ شیر شاہ سوری نہایت ذہین شخص تھا۔ اُس کو فارسی، ادب، تاریخ اور مذہب پر خاصی دسترس حاصل تھی۔ شیر شاہ سوری کا زیادہ وقت جنگوں میں گزرا۔ وہ اپنے عہد حکومت میں اپنے دارالحکومت میں نہ بیٹھ سکا۔ اُس نے دو مرتبہ ہمایوں کو جنگ میں شکست دی اور دربدری میں ہی ہمایوں کے گھراکبر کی ولادت ہوئی جو بعد میں شہنشاہ بنا۔

شیر شاہ سوری ایک جنگجو ہی نہیں تھا بلکہ بہترین منتظم بھی تھا۔ اُس نے انتظامی امور کیلئے ہندوستان کو سینتالیس ضلعوں میں تقسیم کر دیا اور اُسے سرکار کا نام دیا۔ ہندوستان میں روپے کے استعمال کا آغاز شیر شاہ سوری نے کیا۔ سونے کے سکے کو اشرفی، چاندی کے سکے کو روپیہ اور تانبے کے سکے کو دام کا نام دیا اور پھر اٹھنی، چونی، دوئی، ایک آنہ، پیسہ اور روپے کی قدر سولہ آنے شیر شاہ سوری نے ہی رکھی۔ روپے کا استعمال آج بھی پاکستان، انڈیا، نیپال اور مالدیپ وغیرہ میں ہوتا ہے اور دام کو ہم قیمت کی اصطلاح میں استعمال کرنے لگے ہیں جبکہ حقیقتاً یہ بھی سکے تھا۔ برصغیر پاک و ہند میں آج جو عدالتی نظام چل رہا ہے، شیر شاہ سوری نے ہی قائم کیا تھا۔ نظام حکومت کو بہتر بنانے اور عوام میں بہتر رابطے کیلئے شیر شاہ سوری نے غیر فوجی افراد کو گورنر بنایا۔ شیر شاہ سوری کا سب سے بڑا کارنامہ جی ٹی روڈ (گرینڈ ٹرنک روڈ) ہے جو چٹاگانگ سے شروع ہو کر آگرہ، دہلی، لاہور سے جلال آباد ہوتی ہوئی پشاور اور پھر کابل جاتی ہے، اسی سڑک کا ایک حصہ لاہور سے ملتان اور سندھ تک بھی جاتا ہے، دوسرا حصہ آگرہ سے بنارس تک جاتا ہے اور تیسرا حصہ آگرہ سے جودھ پور تک بھی جاتا ہے۔ ان سڑکوں کی لمبائی اڑھائی ہزار کلومیٹر ہے۔ شیر شاہ سوری اپنے عہد حکومت میں چونکہ جنگ و جدل میں مصروف رہا، اس لئے لوگ اُسے شہنشاہ کی بجائے جرنیل کے نام سے جانتے تھے اور اسی مناسبت سے اس کو جرنیلی سڑک بھی کہتے ہیں۔ سڑک کے کنارے سایہ اور پھل دار درخت لگوائے، جگہ جگہ سرائیں تعمیر کروائیں۔ سڑک کے کنارے بنائی گئی سرائوں کی تعداد ایک ہزار سات سو تھی۔ سرائوں میں ہندو اور مسلمانوں کیلئے علیحدہ رہائش گاہیں بنائی گئی تھیں جن میں مسجد و مندر کی سہولتوں کے علاوہ خوراک کا اعلیٰ انتظام کیا گیا تھا، ہر سرائے میں مسجد اور کنوئیں بنائے گئے اور لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کیلئے چوکیدار مقرر کئے گئے تھے۔ امن و امان صورتحال یہ تھی کہ ایک عورت زیورات سے لدی بنگال سے کابل تک بلا خوف جاسکتی تھی۔ جس علاقے میں لوٹ مار کی کوئی واردات ہوتی تھی اُس حکومت کو فوراً برخواست کر دیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے ڈاک کا سرکاری نظام بھی شیر شاہ سوری کا ہی کارنامہ ہے۔

جنگ و جدل میں گھڑ قوم مغلوں کا ساتھ دیتی تھی۔ شیر شاہ سوری نے اُن کو روکنے کیلئے جہلم (دینہ) کے پاس قلعہ روہتاس بنایا۔ جو جی ٹی روڈ کے کنارے پر تھا۔ آج جی ٹی روڈ کا رخ تبدیل ہو گیا ہے اور اب یہ پانچ کلومیٹر دور سے گذرتی ہے۔ جب قلعہ مکمل ہو گیا تو شیر شاہ سوری نے کہا، آج میں

نے لکھڑوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا ہے، اب وہ مُغلوں کی مدد کو نہیں آسکیں گے۔

قلعہ روہتاس نالہ کس، نالہ گھان، گھنے جنگل اور گہری کھائیوں میں گھرا ہوا ہے۔ منفرد بات یہ ہے کہ اسے روایت سے ہٹ کر چھوٹی اینٹوں کی بجائے بڑے بڑے پتھروں سے تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ قلعہ چار سو ایکڑ پر محیط ہے۔ یہ چار سال سات ماہ اور اکیس دن میں مکمل ہوا۔ ایک اندازے کے مطابق اس پر چونتیس لاکھ پچیس ہزار روپے خرچ ہوئے، جس کی مالیت آج اربوں میں بنتی ہے۔ قلعہ کی تعمیر شب و روز ہوتی رہی اور اسے بنانے میں تین لاکھ مزدوروں نے حصہ لیا۔ قلعہ میں بارہ دروازے، 68 برج، 184 برجیاں اور 8556 سیڑھیاں بنائی گئی ہیں۔ قلعہ میں محض چند عمارتیں بنائی گئی تھیں، کوئی محل نہیں بنایا گیا۔ شیر شاہ سوری کے بعد یہ قلعہ مُغلوں کے تصرف میں رہا۔ مغل شہنشاہ یہاں خیمے لگا کر قیام کرتے تھے۔ قلعہ روہتاس اگرچہ بے ہنگم سا نظر آتا ہے مگر اس میں بہترین نقش و نگار اور مینا کاری کی گئی ہے۔ مرکزی دروازے کے اندرونی حصے میں کلمہ اور قرآنی آیتیں کندہ کی گئی ہیں اور تعمیر کا سال 948 ہجری درج ہے۔

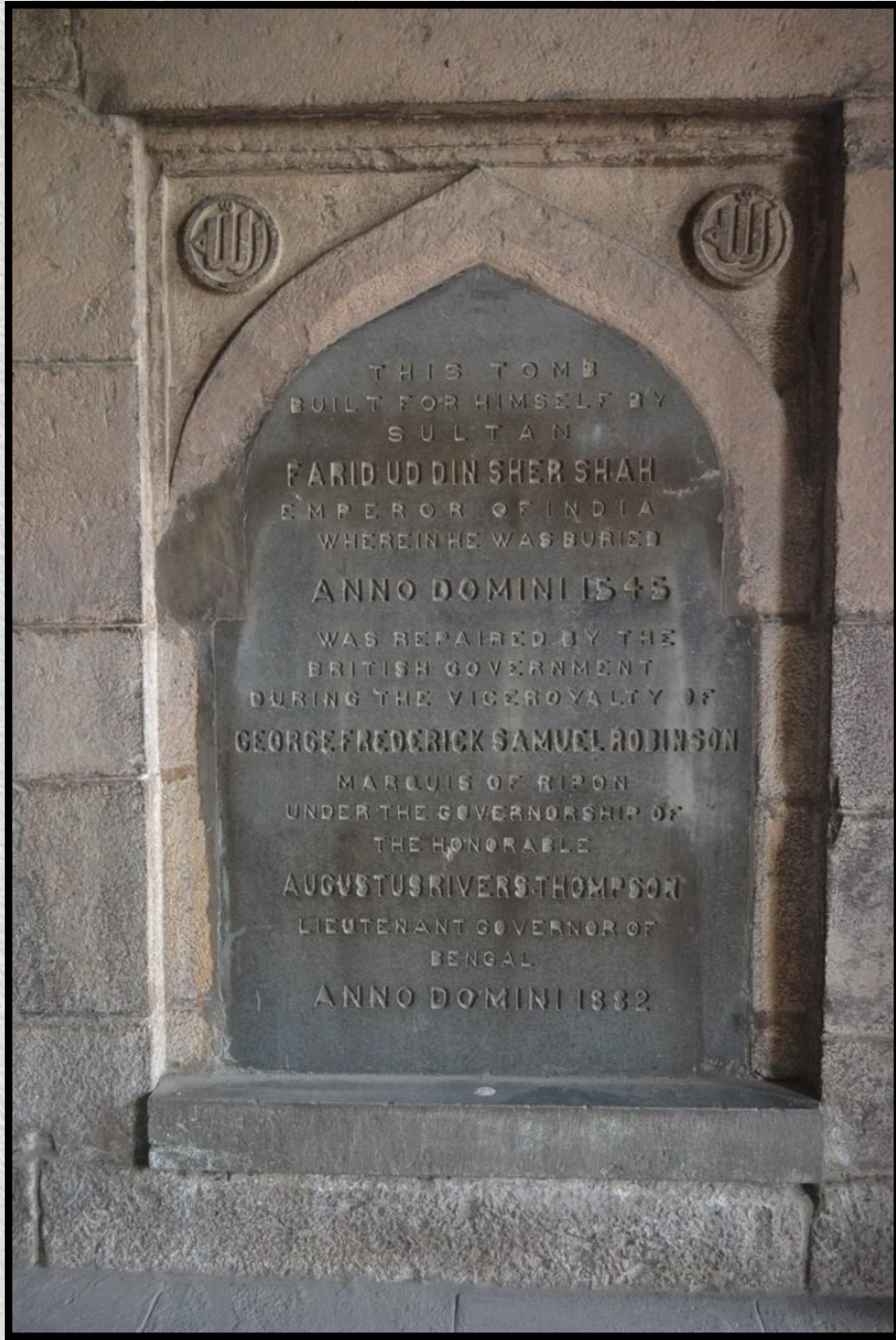
شیر شاہ سوری ایک عادل مسلمان حکمران تھا۔ اُس نے امورِ سلطنت میں ہندوؤں کو بھی عہدوں پر متعین کیا ہوا تھا۔ اُس نے ہر کسی کو مذہبی آزادی دے رکھی تھی عدالتی مقدمات میں اسلامی اور ہندو مذہبی روایات کو مد نظر رکھا جاتا تھا۔ شیر شاہ سوری کا قول تھا کہ:

"انصاف سب سے بڑا مذہبی فریضہ ہے"



سہرام میں شیر شاہ سوری کا مقبرہ

نومبر 1544ء میں شیر شاہ سوری کالنجر قلعہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا کہ بارود خانہ میں آگ لگنے سے زبردست دھماکہ ہوا، جس میں شیر شاہ سوری شدید زخمی ہوا۔ وہ بڑے مضبوط اعصاب کا مالک تھا قلعہ کالنجر کی فتح تک وہ زندہ رہا۔ 22 مئی 1545ء کو اسلام کا یہ بیمثال حکمران اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ شیر شاہ سوری کا مقبرہ سہسرام بہار میں ہے۔



شیر شاہ سوری کے مقبرے کی مرمت انگریز وائسرائے جارج فریڈرک سموئیل روبنسن نے 1882ء میں کروائی۔

جامع مسجد دہلی کی نیلامی

مغلیہ دورِ بادشاہت میں شہنشاہ اکبر کے علاوہ باقی بادشاہوں نے اپنے حکومتی امور میں اسلام کو کافی اہمیت دی۔ ان میں شاہجہاں کا دورِ حکومت خاص طور پر اہم ہے۔ یہ درویش صفت بادشاہ تھا۔ اپنے اخراجات پورے کرنے کیلئے اپنے ہاتھوں سے قرآن لکھتا تھا۔ شاہجہاں ہندوستان میں 1628ء سے 1658ء تک تیس سال حکومت کی۔ سلطنتِ مغلیہ کا دورِ مسلمانوں کی اسلامی تعمیرات کا سنہری دور کہلاتا ہے۔ شاہجہاں نے اپنے دور میں بہت سی عمارتیں اور قلعے تعمیر کروائے اور دہلی کی جامع مسجد شاہجہاں کی خوبصورت تعمیرات میں سے ایک ہے۔ شاہجہاں نے اپنے دورِ حکومت میں لاہور، اجیر، آگرہ اور دہلی میں بڑی خوبصورت مساجد تعمیر کروائیں۔ جامع مسجد دہلی کی تعمیر 1656ء میں مکمل ہوئی۔ یہ مسجد آج بھی قائم ہے اور انڈیا کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ مسجد کے صحن میں پچیس ہزار نمازی بیک وقت نماز ادا کر سکتے ہیں۔

جب 1857ء میں ہندوستان پر انگریز قابض ہوئے تو ہندوؤں اور سکھوں کے ایما پر انہوں نے جامع مسجد دہلی کو نیلام کرنا چاہا۔ نیلامی کی قیمت تین لاکھ روپے تک پہنچ گئی جو اگرچہ اُس دور میں بہت بڑی رقم تھی مگر کئی مسلمان اُمراء اور نوابوں کیلئے یہ کوئی بڑی رقم نہیں تھی۔ اُس وقت کسی نواب یا امیر میں ایمان کی چنگاری نہیں بھڑکی اور کوئی بھی مسجد کو نیلام ہونے سے بچانے کیلئے نہ اٹھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کو اپنے گھر کی نیلامی منظور نہ تھی۔ اچانک ایک پھٹے پرانے کپڑوں والا فقیر (بھیک مانگنے والا) اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا: میں یہ مسجد خریدتا ہوں۔ نیلامی کے مجمع میں پہلے تو خاموشی طاری ہو گئی اور پھر آوازیں آنے لگیں کہ یہ مفلوک الحال شخص کہاں سے اتنی بڑی رقم دے گا؟

نیلامی والوں نے حیرانی سے مفلوک الحال بوڑھے فقیر کو دیکھا اور پوچھا: اے شخص! کیا تم واقعی اس مسجد کو خریدنا چاہتے ہو؟
بھکاری نے کہا: ہاں میں اس مسجد کو خریدنا چاہتا ہوں۔

نیلامی والوں نے کہا کہ اگر تو واقعی مسجد خریدنا چاہتا ہے تو رقم لاؤ اور اسے اپنے نام کرلو۔ یہ سن کر بھکاری اُٹھا اور بولا! انتظار کرو میں ابھی رقم لیکر حاضر ہوتا ہوں۔

سب لوگ انتظار کرنے لگے بوڑھا فقیر گیا اور اپنی جھونپڑی سے کچھ بوریاں اٹھالایا اور انہیں لا کر نیلامی کرنے والوں کے سامنے ڈھیر کر دیا۔ وہاں موجود لوگ نوٹوں کا اتنا بڑا ڈھیر دیکھ کر حیران رہ گئے۔ بھکاری بولا! اپنی رقم اٹھاؤ اور مسجد مسلمانوں کے نام وقف کر دو۔ میرے لئے یہ بات ناقابلِ برداشت ہے کہ مسجد کوئی غیر مسلم حاصل کرے۔ نامعلوم فقیر مسجد کی تحویل کے کاغذات مسلمانوں کے حوالے کر کے چلتا بنا، مگر اُس دور کے مسلمان اُمراء اور نوابوں کے منہ پر طمانچہ مار گیا۔ سچ ہے کہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی محبت سے بھرے دل کیلئے امارت یا غربت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر

یوں تو مغل بادشاہوں کا طرزِ حکومت بھی زیادہ تر خلافتِ بنو امیہ، خلافتِ عباسیہ اور خلافتِ عثمانیہ کے حکمرانوں جیسا تھا، مگر اورنگ زیب عالمگیر ایک درویش صفت بادشاہ تھا۔ وہ اپنے ہاتھ سے قرآنِ پاک لکھتا تھا اور فروخت کر کے اپنی گزر بسر کرتا تھا۔ اُس کے دور میں فتاویٰ عالمگیری لکھی گئی۔ جس میں اسلامی احکام و مسائل کو امام ابو حنیفہؒ کی فقہ کے مطابق بیان کیا گیا ہے، کتاب مرتب کرنے والے علماء کی نگرانی اورنگ زیب عالمگیر نے خود فرمائی۔ اُنکو بارہ ہزار احادیثِ زبانی یاد تھیں اور وہ شاہی مسجد میں نماز کی امامت خود کرتے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی سلطنت میں بخارا (روس)، برما، ہرات (افغانستان) اور موجودہ پاک و ہند شامل تھے۔

مورخین نے اُن کے دور کا ایک واقعہ بیان کیا ہے:

ملاجیون رحمۃ اللہ علیہ مغلیہ دور کے مشہور عالم تھے۔ مشہور کتاب "نور الانوار" انہیں کی لکھی ہوئی ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر ملاجیون رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ ایک مرتبہ ملاجیون رحمۃ اللہ علیہ اپنے شاگرد اورنگ زیب عالمگیر سے ملنے گئے۔ علم و ادب کی اس نشست میں اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے استادِ محترم ملاجیون رحمۃ اللہ علیہ کی خوب آؤ بھگت کی اور رخصت کے وقت اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے استادِ محترم کو ایک دوئی کا سکہ دیا، انہوں نے یہ سوچتے وہ سکہ رکھ لیا کہ اورنگ زیب بڑا دور اندیش شخص ہے اُس نے یہ سکہ ضرور کسی خاص مقصد کے تحت دیا ہے، وگرنہ بادشاہ اور محض دوئی دے۔

ملاجیون رحمۃ اللہ علیہ گھر واپس آئے تو سکہ بیوی کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولے: نیک بخت یہ سکہ بادشاہ سلامت نے عطا فرمایا ہے، مجھے تو یہ غیر معمولی لگتا ہے، تم اسے کسی کاروبار میں لگا دو۔ بیوی نے کچھ سوچنے کے بعد انڈے منگوائے اور چوزوں کیلئے مرغی بٹھادی۔ چوزے نکلے تو پھر بڑے ہو کر مرغیاں بن گئیں۔ بیوی نے انڈے بیچنے شروع کر دیئے۔ کاروبار نے ترقی کی تو مرغیوں سے بکریوں اور پھر بھینسوں کا کاروبار کرنے لگے۔ پھر آمدنی سے کچھ جائیداد خرید لی۔

جب اچھے دن آتے ہیں تو پھر دوست و احباب، رشتہ دار اور پڑوس والے حسد میں مبتلا ہونے لگتے ہیں۔ ملاجیون رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اُنکی امارت کے بارے میں چہ گوئیاں ہونے لگیں، جو گلی محلہ اور پھر شہر سے بھی باہر کی جانے لگیں۔ یہ بات جب شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر تک پہنچیں تو انہوں نے اپنے استادِ محترم کو بلایا اور پوچھا کہ یہ لوگ تمہارے بارے میں کیا اُلٹی سیدھی باتیں کر رہے ہیں؟ یہ تمہاری امارت کی حقیقت کیا ہے؟

ملاجیون رحمۃ اللہ علیہ نے بتایا: اورنگ زیب! تمہیں یاد ہے کہ ایک مرتبہ جب ہماری ملاقات ختم ہوئی تو جاتے وقت آپ نے مجھے ایک دوئی دی تھی۔

میں اُسی وقت سمجھ گیا تھا کہ یہ دوّنی غیر معمولی ہے۔ پھر ساری کہانی بیان کرنے کے بعد کہنے لگے۔ اورنگ زیب! مجھے آج بھی اُس دوّنی کے بارے میں جاننے کا تجسس ہے۔

ملا جیون رحمۃ اللہ علیہ کی بات سن کر شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر روتے ہوئے بولے: میں اس بات کو راز میں ہی رکھنا چاہتا تھا مگر اب آپ کا حکم ہے تو میں بیان کئے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے ایک خدمتگار کو حکم دیا کہ فلاں مہاجن (ساہوکار جو لوگوں کو رتم ادھار دیتے تھے) کو بلا کر لاؤ اور کہنا کہ فلاں سال کا حساب کھاتہ لے کر آنا۔

جب مہاجن حاضر ہو گیا تو شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر بولے: فلاں تاریخ کا قصہ سناؤ جو تم نے کسی شخص سے گھر کا کام کروایا تھا؟ مہاجن تھوڑی دیر اپنی بھی کھاتے کی کتاب کے ورق الٹا پلٹا رہا اور پھر بتانے لگا۔ ایک رات بارش سے میرے گھر کی چھت ٹپک رہی تھی۔ میری بیوی کہنے لگی کہ کسی مزدور سے چھت پر مٹی ڈلوالو۔ میں باہر نکلا تو دیکھا کہ ایک گھر کی دیوار کیساتھ ایک آدمی کھڑا تھا۔ میں نے قریب جا کر اُس سے پوچھا: کیا مزدوری کرو گے؟ وہ آدمی بولا: کیا کام ہے؟

میں نے بتایا کہ گھر کی چھت ٹپک رہی ہے، اُس کی مرمت کرنی ہے۔ وہ آدمی راضی ہو گیا اور بڑی محنت سے مٹی لا کر میرے گھر کی چھت مرمت کر دی۔ کام مکمل کر کے وہ آدمی بولا: لاؤ مجھے میری مزدوری دیدو؟ میں نے کہا کہ میں گھر میں پیسے نہیں رکھتا، اس لئے تم کل دن میں آکر اپنی مزدوری لے جانا۔ وہ آدمی بولا: گھر میں جو بھی رقم موجود ہے، مجھے ابھی دیدو، میں کل نہیں آؤں گا۔ اُس شخص کی بات سن کر میں گھر گیا اور ایک دوّنی لا کر اُس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولا: اے شخص! تم اپنی باقی مزدوری دن کے وقت مجھ سے لے جانا مگر وہ شخص پھر نہیں آیا۔

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے واقعہ سن کر مہاجن سے کہا۔ اچھا اب تم جاؤ۔ جب وہ شخص چلا گیا تو شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر بولا: اُستادِ محترم! وہ مزدور آپکا شاگرد اورنگ زیب عالمگیر تھا۔

(بحوالہ: قرآنی دائرۃ المعارف، باب تذکرۃ قاریانِ ہند)

مسلمان حکمران کی محبتِ رسول اللہ ﷺ

سلطان عبدالحمید ثانی خلافتِ عثمانیہ کے چونتیسویں خلیفہ تھے۔ وہ 1876ء میں خلیفہ بنے اور 1906ء تک انکی خلافت قائم رہی۔ تھا۔ خلیفہ عبدالحمید ثانی اکیس ستمبر 1842ء میں ترکی کے شہر استنبول میں پیدا ہوئے۔ خلیفہ عبدالحمید ثانی کا دور خلافتِ عثمانیہ کے بہترین ادوار میں شمار ہوتا ہے۔ انہیں کثیر الا ازواج اور کثیر الاولاد خلیفہ بھی کہا جاتا ہے۔ خلیفہ عبدالحمید ثانی شاعرانہ طبیعت کے مالک تھے۔ اسلام سے بیحد جذباتی لگاؤ تھا۔ ان کے دور میں سلطنتِ عثمانیہ میں ترکی، مصر، یونان، بلغاریہ، رومانیہ، ہنگری، مقدونیہ، فلسطین، لبنان، شام، اردن اور جنوبی افریقہ کے ساحلی علاقے شامل تھے۔ خلافتِ عثمانیہ کی سرحدیں تین براعظموں کے وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھیں۔

ایک روز خلیفہ عبدالحمید ثانی کی مجلس میں مشیر اور وزراء موجود تھے کہ ایک خلافتی عہدیدار نے خلیفہ سے اجازت طلب کرتے ہوئے انہیں ایک فرانسیسی اخبار تھماتے ہوئے ایک خبر کی جانب اشارہ کیا۔ خبر پڑھتے ہی خلیفہ کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ فرانس کے ایک تھیٹر میں ایک ڈرامہ پیش کیا جانے والا تھا کہ جس میں نہ صرف رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخیاں کی گئی ہیں بلکہ نعوذ باللہ ایک اداکار رسول اللہ ﷺ کا کردار ادا کرنے کی بھی گستاخی کرے گا۔ خلیفہ عبدالحمید ثانی نے وہ خبر بلند آواز میں اہل مجلس کو سنائی۔ خبر پڑھتے ہوئے خلیفہ نہایت جلال میں تھا اور اُس کا بدن غصے سے کانپ رہا تھا۔ اتفاق سے جس روز یہ اخبار خلیفہ کے ہاتھ میں آیا، اُسی شب یہ ڈرامہ اسٹیج کیا جا رہا تھا۔

خلیفہ عبدالحمید ثانی نے اہل مجلس سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا: خدا کی قسم! اگر وہ میرے بارے میں کوئی بکواس کرتے تو میں ہر گز غم نہ کرتا، مگر کوئی میرے پیارے نبی محمد ﷺ کی شان میں گستاخی کرے، یہ بات میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ میرے لئے تو یہ جیتے جی مر جانے کا مقام ہے۔ اللہ کی قسم! میں ان کے خلاف تلوار اٹھاؤں گا اور اس لڑائی میں میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے بھی ہو جائیں تو مجھے کچھ پرواہ نہیں، میں انہیں برباد کر دوں گا تا کہ قیامت کے روز مجھے رسول اللہ ﷺ کے سامنے شرمندگی نہ ہو۔ یہ جنگ دشمن کو آگ میں جلا کر رکھ کر دیگی اور دنیا کیلئے باعثِ عبرت ہوگی، پھر کسی کو ایسی گستاخی کرنے کی جرات نہیں ہوگی۔

خلیفہ عبدالحمید ثانی نے فرانسیسی سفیر کو فوراً دربار میں طلب کیا اور خود لباسِ فاخر پہن کر دربار میں آگئے۔ خلیفہ اس قدر جلال میں تھا کہ اُس نے تخت پر بیٹھنا بھی گوارا نہ کیا۔ جب فرانسیسی سفیر دربار میں داخل ہوا تو خلیفہ کو تخت کے سامنے کھڑے پایا۔ خلیفہ کا چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔ سفیر کو اندازہ ہو گیا کہ اُسے کسی غیر معمولی بات پر طلب کیا گیا ہے۔

سلطان نے سفیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ہم مسلمان اپنے دین سے بہت محبت کرتے ہیں اور نبی محمد ﷺ ہمیں اپنی جانوں سے بھی بڑھ کر عزیز ہیں۔ ان کی عظمت پر کوئی آنچ آنے لگے تو ہم اپنی جانوں کے نذرانے دینے میں ذرا بھی تردد نہیں کرتے۔ پھر اخبار سفیر کی طرف اُچھالتے ہوئے

بولے: یہ سب کیا ہے؟ تم جانتے ہو کہ اس ڈرامے اگر نہ روکا گیا تو ہم مسلمانوں کا ردِ عمل کیا ہو گا؟ خدا کی قسم اگر تم نے یہ حرکت کی تو میں فرانس کو تباہ و برباد کر دوں گا کیونکہ میں اپنے نبی محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان میں گستاخی ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔ میرا یہ پیغام اپنی حکومت تک پہنچا دو۔ یہ کہہ کر سلطان عبدالحمید ثانی بڑی تیزی سے دربار سے باہر نکل گئے۔

سلطان عبدالحمید ثانی کا پیغام سن کر فرانسیسی سفیر کے اوساں خطا ہو گئے۔ وہ اخبار ہاتھ میں تھامے ڈمگاتا ہوا دربار سے باہر نکل گیا اور فوراً سفارت خانے پہنچا اور اپنی حکومت کو فوری پیغام پہنچایا: محمد (ﷺ) عربی کی شان میں گستاخانہ ڈرامہ اگر فوری طور پر نہ روکا گیا تو پھر تم فرانس کو اپنی آنکھوں سے جلتا ہوا دیکھو گے اور اسلامی پرچم کو فرانس میں لہرانے سے نہ روک سکو گے کیونکہ عثمانی لشکر تیار ہو کر سلطان کے حکم کا منتظر ہے۔

سلطان عبدالحمید ثانی دربار سے نکلا تو سیدھا اپنے دفتر پہنچا اور مشیر خاص کو طلب فرمایا اور حکمنامہ لکھوایا: خلافتِ عثمانیہ کے عوام کو معلوم ہو کہ فرانسیسیوں کی اسلام دشمن کاروائیاں حدود سے تجاوز کر چکی ہیں، جس سے ہمارے صبر و ادب کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اب ہم اسلام کی سر بلندی اور خلافت کا پرچم بلند رکھنے کیلئے ایک فیصلہ کن جہاد کرنے جا رہے ہیں۔ اب ہم اُن سے اُنہی کی زبان میں بات کریں گے۔ سلطان کے حکم کی دیر تھی کہ سلطنت میں فوجوں نے نقل و حرکت شروع کر دی۔ سلطنتِ عثمانیہ میں ہونیوالی تمام کاروائیوں کی لمحہ بہ لمحہ رپورٹ فرانسیسی حکومت تک پہنچ رہی تھی۔

فرانس کے سفیر نے اپنی حکومت کو پیغام بھجوایا کہ اگر وہ یورپ کو آگ میں جلتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے اور فرانس پر اسلام کا پرچم لہراتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے تو پھر آج شروع ہونے والے تھیٹر ڈرامے کو فوراً روکواؤ، ورنہ اسلامی فوجیں جنگ کیلئے تیار کھڑی ہیں اور صرف سلطان کے اشارے کی منتظر ہیں۔ سفیر کے بھجوائے ہوئے پیغام کو سن کر فرانسیسی حکومت لرز گئی اور اُنہیں اپنے اقتدار کا خاتمہ ہوتا ہوا نظر آنے لگا۔ آناً فاناً یہ پیغام پورے یورپ میں پھیل گیا اور فرانسیسی حکومت نے حالات سے مجبور ہو کر مداخلت کرتے ہوئے تھیٹر کو ڈرامہ اسٹیج کرنے سے روکتے ہوئے ملکی سلامتی خطرے میں ڈالنے کے جرم میں ہمیشہ کیلئے بند کر دیا اور اپنے سفیر کو پیغام بھجوادیا۔

خليفة سلطان عبدالحمید ثانی اپنے کمرہ خاص میں غصے اور اضطراب کی کیفیت میں تھے کہ اچانک ایک حکومتی عہدیدار اجازت لئے بغیر ہی اندر داخل ہوا اور پُر جوش انداز میں بولا: سلطانِ محترم! حکومتِ فرانس کی جانب سے اچھی خبر آئی ہے کہ اُنہوں نے نہ صرف ڈرامے کو روک دیا بلکہ اُس تھیٹر کو بھی ہمیشہ کیلئے بند کر دیا۔ حکومتی عہدیدار کی بات سن کر فرطِ جذبات سے خلیفہ عبدالحمید کی آنکھیں نم ہو گئیں اور زبان سے الحمد للہ کے الفاظ نکلے۔ حکومتِ فرانس نے نہ صرف اپنے سفیر کو حکومتی فیصلے سے آگاہ کیا بلکہ یہ خبر ریڈیو پر بھی نشر کروادی۔ حکومتی عہدیدار نے خلیفہ کو یہ بھی بتایا پورے عالمِ اسلام سے آپ کیلئے شکریہ کے پیغام آرہے ہیں۔ لیورپول انگلستان سے اسلامی تنظیم نے اطلاع بھجوائی ہے کہ مسلمانوں نے شہر کی سڑکوں پر نکلتے ہوئے احتجاج کیا اور غیر مسلموں نے بھی اُن کا ساتھ دیا کہ وہ مسلمانوں کے رسول ﷺ کی شان میں گستاخی برداشت نہیں کر سکتے۔ مصر اور الجزائر

کے لوگ فرانسیسی حکومت کے اقدام کی خبر سُن کر کوشی کے مارے سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ سلطانِ محترم! اللہ آپ سے راضی ہو۔ یہ کہتے ہوئے حکومتی عہدیدار نے خلیفہ کو دیکھا تو اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ انہوں نے بمشکل گردن اٹھا کر عہدیدار کی جانب دیکھا اور گویا ہوئے: اے پاشا! مجھے اللہ نے یہ عزت اس لئے عطا فرمائی کہ میں اللہ، اُس کے نبی محمد ﷺ اور دین کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ یہ میرے اللہ کا پیغام تھا جو میں نے اُن لوگوں تک پہنچا دیا۔ اس کیلئے مجھے کسی دنیاوی لقب یا صلے کی ضرورت نہیں، میں تو اسی پر راضی ہوں کہ میرا اللہ مجھ سے راضی ہوا۔ یہ کہہ کر خلیفہ سلطان عبد الحمید ثانی کمرے سے باہر نکلے کہ مسلمانوں کے جذبات کو دیکھ سکیں۔ خلافتِ عثمانیہ مسلمانوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ جب اُن کے رُعب و جلال سے مُشرکینِ یورپ پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا اور آج مسلمان حکمران کا سہ گدائی لئے اُن کی خیرات کے منتظر ہیں۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ جوابِ شکوہ میں اللہ کا پیغام دیتے ہیں:

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں
 راہ دکھلائیں کسے، رہرو منزل ہی نہیں
 کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
 ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں
 کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
 یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

کمن عاشق رسول اللہ (ﷺ)

علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ایک دفعہ میں حج پر گیا ہوا تھا۔ حج سے فارغ ہو کر میں رسول اللہ ﷺ کے روضہ پر حاضری کیلئے مدینہ منورہ چلا گیا۔ ایک روز ہم لوگ کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو میں نے دسترخوان اٹھایا اور باہر جا کر ایک طرف جھاڑ دیا تاکہ روٹی کے بچے ہوئے ٹکڑے اور ہڈیاں جانور کھائیں۔ کچھ دیر بعد میں کمرے سے باہر نکلا تو میری نظر نو دس سال کے ایک خوبصورت بچے پر پڑی جو میرے پھینکے ہوئے روٹی کے ٹکڑے چُن چُن کر کھا رہا تھا۔ مجھے بہت افسوس اور شرمندگی ہوئی۔ میں بچے کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے آیا۔ میں نے بچے کو پیٹ بھر کر کھانا کھلایا۔ بچہ جب رخصت ہونے لگا تو میں نے پوچھا:

بیٹا! تمہارے والد کیا کام کرتے ہیں؟

وہ بچہ بڑے معصومانہ انداز میں بولا: میں یتیم ہوں۔

میں نے کہا: بیٹا! تم میرے ساتھ ہندوستان چلو، وہاں میں تمہیں پہننے کیلئے اچھے اچھے کپڑے اور کھانے کیلئے اچھا کھانا دوں گا۔ وہاں میرا ایک مدرسہ ہے، تم اُس میں دینی تعلیم حاصل کر کے عالم فاضل بن جاؤ گے تو میں تمہیں تمہاری والدہ کے پاس چھوڑ جاؤں گا۔ تم اب گھر جاؤ اور اپنی والدہ سے میرے ساتھ جانے کی اجازت لے آؤ۔

بچہ خوشی خوشی اچھلتا کودتا اپنے گھر چلا گیا۔ اُس نے اپنی ماں کو ساری کہانی سناتے ہوئے کہا: اماں! وہ مولانا صاحب کہہ رہے تھے کہ اگر میں اُن کیساتھ ہندوستان چلا جاؤں تو وہ مجھے اچھے کھانے اور کپڑے دیں گے اور مجھے اچھی تعلیم دیکر واپس چھوڑ جائیں گے، اماں! اگر تم اجازت دو تو میں مولانا صاحب کیساتھ چلا جاؤں؟

بیوہ ماں بچوں کے اخراجات سے پریشان تھی، اس لئے اُس نے بیٹے کو بخوشی ہندوستان جانے کی اجازت دیدی۔

تھوڑی ہی دیر بعد بچہ واپس آگیا۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اُس کی ماں نے اُسے میرے ساتھ جانے کی اجازت دیدی ہے۔ بچہ خوشی سے بولا: میری ماں نے مجھے آپ کیساتھ جانے کی اجازت دیدی ہے۔ پھر وہ بڑے بھولے انداز میں بولا: ہم جہاں جا رہے ہیں، کیا وہاں کھانے کو چنے ملیں گے؟

مولانا عثمانی بولے: بیٹا! وہاں یہ سب وافر مقدار میں ملتا ہے۔

میں واپس جانے سے پہلے سرکارِ دو عالم رسول اللہ ﷺ کے روضہ مبارک کو الوداعی نظر سے دیکھنے کیلئے چلا تو بچہ میری انگلی پکڑے میرے ساتھ چلا آیا۔ میں الوداعی دُعائیں کرتا ہوا واپس پلٹنے لگا تو میری نظر بچے پر پڑی، اُس کے چہرے پر ایک عجیب سی خوشی تھی۔ میں نے واپسی کیلئے اُس کی انگلی پکڑی تو وہ بے چین ہو کر بڑے بھولے سے انداز سے بولا: بابا! کیا وہاں یہ دروازہ اور روضہ مبارک بھی ہو گا؟

میں نے کہا: بیٹا! اگر یہ مجھے وہاں مل جاتا تو میں یہاں کیوں آتا؟

میری بات سن کر بچے کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور اُس نے میری انگلی چھوڑتے ہوئے کہا: اگر یہ وہاں نہیں ملے گا تو میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤنگا، میں یہ در چھوڑ کر ہرگز نہیں جاؤنگا۔ میں بھوکا اور پیاسا اس دروازے کو دیکھ کر اپنی بھوک اور پیاس بھال لیا کرونگا، جس طرح آج تک بھجھا تارہا ہوں۔ یہ کہہ کر بچہ رونے لگا۔

کمن اور معصوم بچے کا اپنے رسول اللہ ﷺ سے عشق دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار نکلا: اللہ اکبر، اور پھر میری آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہہ نکلے۔

ایک بھکاری کا ایمان

مُغلیہ شہنشاہت کا دور ختم ہو چکا تھا، برصغیر میں برطانیہ کے گورے حکومت کر رہے تھے۔ غربت کے مارے بھکاری لوگ جامعہ مسجد دہلی کے دروازے پر بیٹھ جاتے تھے، جنہیں کوئی نمازی یا پھر سیاح کچھ نہ کچھ دے جاتے تھے، جس سے انکی بنیادی ضرورتیں پوری ہو جاتی تھیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک انگریز سیاح مُغلیہ دور کی بنی ہوئی مسجد کو دیکھنے کیلئے مرکزی دروازے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ ایک بھکاری نے خیرات کیلئے اُس کے آگے ہاتھ پھیلا یا تو انگریز سیاح نے جیب سے بٹوان نکالا اور اُس میں سے کچھ رقم نکال کر بھکاری کے ہاتھ پر رکھ دی اور بٹوا واپس پتلون کی جیب میں ڈالا تو اتفاق کی بات ہے کہ بٹوا جیب کی بجائے باہر جاگرا، انگریز سیاح کو اس کی خبر نہ ہوئی اور وہ وہاں سے چلا گیا۔ اتفاق سے اُسی بھکاری کی نظر بٹوے پر پڑی تو اُس نے اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا۔

ایک سال بعد بھکاری جامع مسجد کے مرکزی دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا تھا کہ اُس کی نظر انگریز سیاح پر پڑی، وہ آج پھر جامع مسجد دہلی دیکھنے آیا تھا۔ بھکاری اُٹھ کر دوڑتا ہوا اُس انگریز سیاح کے پاس گیا اور بٹوا نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولا: صاحب! اُس دن آپ کا بٹوا گر گیا تھا، میں نے بہت ڈھونڈا مگر آپ نہیں ملے۔

انگریز سیاح حیران ہو کر بولا: اس بٹوے میں اچھی خاصی رقم موجود تھی، کیا یہ رقم دیکھ کر تمہاری نیت نہیں بگڑی؟

بھکاری بولا: صاحب! میرے دل میں بے ایمانی کا خیال آیا تھا مگر؟ بھکاری خاموش ہو گیا۔

انگریز سیاح بولا: مگر کیا؟ کچھ بتاؤ تو سہی؟

بھکاری بولا: صاحب! میرے دل میں خیال آیا کہ میری اس حرکت کی وجہ سے میرے نبی محمد ﷺ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے شرمندگی ہوگی کہ اُن کے ایک اُمتی نے بے ایمانی کی اور یہ مجھے منظور نہیں۔

انگریز سیاح کچھ رقم بھکاری کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولا: چلو اپنی ایمانداری کا کچھ صلہ لے لو۔

بھکاری بولا: صاحب! نہیں میں یہ رقم لیکر اپنے نبی محمد ﷺ کے سامنے شرمندگی نہیں اُٹھانا چاہتا کہ میں نے یہ بٹوا کسی انعام کے لالچ میں واپس لوٹایا ہے۔

انگریز سیاح بھکاری کا جذبہ ایمان دیکھ کر حیران رہ گیا۔

سبحان اللہ! ایک بھکاری کے اندر چھپا ہوا مسلمان کتنا کھرا اور سچا تھا، اور اُسے نبی محمد ﷺ سے کتنی عقیدت تھی۔ ذرا سوچیے؟؟؟

ایک مومن کی استقامت پر عورت کا مسلمان ہو جانا

لیڈی بارس کا قبول اسلام عجیب واقعہ ہے۔ وہ ایک نو مسلم انگریز فوجی کی بیوی تھیں۔ دونوں میاں بیوی ایک مقدمے میں ملوث ہو کر علامہ اقبال کے پاس آئے۔ چونکہ الزامات سراسر جھوٹے تھے اس لیے عدالت نے ان دونوں کو باعزت بری کر دیا۔ اس کیس میں چونکہ وکالت کے فرائض علامہ اقبال نے انجام دیے تھے، اس لیے چند روز بعد لیڈی بارس شکر یہ ادا کرنے کے لیے لاہور علامہ اقبال کے پاس تشریف لائیں۔ اس وقت علامہ اقبال نے سوال کیا:

لیڈی صاحبہ! آپ کے مشرف بہ اسلام ہونے کے اسباب کیا ہیں؟

مسلمانوں کے ایمان کی استقامت "ڈاکٹر صاحب! لیڈی بارس نے جواب دیا۔"

ڈاکٹر اقبال نے کہا: لیڈی صاحبہ! میں سمجھا نہیں کہ اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟

لیڈی صاحبہ نے وضاحت میں یہ واقعہ بیان کیا:

ڈاکٹر صاحب میں نے دیکھا ہے کہ دنیا بھر میں کوئی بھی قوم ایسی نہیں جس کا مسلمانوں کی طرح ایمان پختہ ہو۔ بس اسی چیز نے مجھے اسلام کا حلقہ بگوش بنادیا ہے۔ لیڈی نے اپنا نظریہ پیش کر کے تھوڑا سا تامل فرمایا اور کہا:

ڈاکٹر صاحب! میں ایک ہوٹل کی مالکہ تھی۔ میرے ہوٹل میں ایک ستر سالہ بوڑھا مسلمان ملازم تھا۔ اس بوڑھے کا فرزند نہایت ہی خوب صورت نوجوان تھا جو ایک نہایت مہلک بیماری مبتلا تھا۔ ایک روز اُس لڑکے کا انتقال ہو گیا تو مجھے بے حد صدمہ ہوا۔ میں بوڑھے کے پاس تعزیت کے لیے گئی۔ اسے تسلی دی اور دلی رنج و غم کا اظہار کیا۔ بوڑھا نہایت توجہ سے میرے تعزیتی الفاظ سن رہا اور جب میں غم کی باتیں ختم کر چکی تو اس نے نہایت شاکرانہ انداز میں آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور کہا:

میم صاحبہ! خدا کی مرضی یہی تھی، میرا بیٹا میرے پاس خدا کی امانت تھی تو وہ اُس نے واپس لے لی۔ اس میں غم زدہ ہونے کی کیا بات ہے؟ ہمیں تو ہر حال میں خدائے غفور الرحیم کا شکر ادا کرنا ہے۔ لیڈی بارس اتنا کہہ کر رک گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا انہوں نے کوئی بہت بڑا معجزہ بیان کیا ہے اور اب وہ چاہتی تھیں کہ میں بھی ان کے ساتھ مل کر حیرت کا اظہار کروں۔ لیڈی بارس کی بات مجھے دلچسپ لگی تو میں نے پوچھا: لیڈی صاحبہ! پھر کیا ہوا؟

لیڈی نے پھر اپنا قصہ بیان کرنا شروع کیا اور کہا: ڈاکٹر صاحب! بوڑھے کا آسمان کی طرف انگلی اٹھانا ہمیشہ کے لیے میرے دل میں پیوست ہو گیا۔ میں بار بار اس کے الفاظ پر غور کرتی تھی اور حیران تھی کہ الہی اس دنیا میں اس قسم کے صابر و شاکر اور مطمئن دل بھی موجود ہیں؟ مجھے بڑی حیرانی تھی کہ

بوڑھے نے ایسا پُر استقامت دل کیسے پایا؟ پھر میں نے بوڑھے سے پوچھا کہ کیا مرحوم کے اہل و عیال بھی تھے؟ وہ کہنے لگا۔ ایک چھوٹا بچہ اور ایک بیوی ہے۔ بوڑھے کے اس جواب نے میری حیرت کم کر دی۔ میں نے سوچا کہ بوڑھے کے پاس چونکہ اپنے بیٹے کی نشانی پوتا موجود ہے اس لئے وہ حوصلے میں ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب میں نے اس معقول وجہ سے اپنے دماغ کو تو راضی کر لیا مگر میرے دل کو اطمینان نہ ہوا اور میں برابر اس پڑتال میں لگی رہی کہ کسی طرح اپنے بوڑھے ملازم کی صحیح کیفیت سمجھوں۔ اس واقعے کے تھوڑے ہی دن بعد یتیم بچے کی ماں بھی چل بسی۔ اس سے میرے دل کو بہت تکلیف ہوئی۔ بوڑھے کی بہو کا غم میری عقل پر چھا گیا مگر ٹھیک اسی وقت میری وہ قدیم تڑپ بھی جاگ اٹھی اور میں نے خیال کیا کہ بوڑھے کے امتحان کا اصل وقت یہی ہے۔ اس کے نوجوان فرزند کی وفات کے بعد اب اس کی بہو کی موت نے تو بوڑھے کے غم کی شدت میں اور اضافہ کر دیا ہو گا۔ میں دوسرے دن بوڑھے کے گاؤں روانہ ہوئی تاکہ میں اُسکی دلی کیفیت کا اندازہ کر سکوں؟ بوڑھے کا گاؤں بالکل قریب ہی تھا۔ دورانِ سفر میں سوچتی جا رہی تھی کہ اس تازہ مصیبت نے بوڑھے کے دل کی حالت کو یقیناً بدل دیا ہو گا۔ وہ کبھی تو اپنے بوڑھے پن اور حال زار پر غور کرتا ہو گا اور کبھی اپنے یتیم پوتے کی کم سنی کو دیکھتا ہو گا اور پھر غم میں ڈوب جاتا ہو گا؟ دوسرے ہی لمحے میں یہ سوچنے لگتی تھی کہ جب اس کا معصوم، کمسن اور لاوارث پوتا ماں باپ کے فراق میں بلبلائے گا تو وہ کس طرح سے اُس کے اور اپنے دل کو تسلی دے گا؟ وہ بچے کے آنسوؤں کا کیا جواب دیگا؟ اپنی ضعیفی اور اپنے پوتے کے مستقبل کے بارے اپنی تشویش کو کیسے کم کرے گا؟ ان تمام سوالات کو سوچ کر میرے دل اور دماغ نے جو فیصلہ کیا وہ یہ تھا کہ اب تو بوڑھے کا صبر و استقامت یقیناً ختم ہو چکا ہو گا۔

میری سوچ یہاں تک پہنچی تو میرا سفر ختم ہو چکا تھا۔ میں اپنی اسی سوچ کیساتھ بوڑھے کے گھر میں داخل ہوئی اور اس کے تازہ غم پر افسوس کا اظہار کیا اور اسے اپنی ہمدردی کا یقین دلایا۔ وہ نہایت امن و سکون سے میری درد مندانہ باتیں سنتا رہا اور پھر اُس نے اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھادی اور کہا: میم صاحبہ! خدا کی تقدیر کے آگے کوئی بھی شخص دم نہیں مار سکتا۔ اسی نے دیا تھا اور وہی لے گیا۔ ہمارے لئے تو ہر حال میں اس کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔ لیڈی بارس بوڑھے کے الفاظ ادا کرنے کے بعد رکیں گویا وہ مجھ سے میرے تاثرات جاننا چاہتی تھیں۔ پھر مجھے خاموش پا کر ذرا سے تامل کے بعد اُس نے سلسلہٴ کلام شروع کیا اور کہا: ڈاکٹر صاحب! میں جب تک بوڑھے کے پاس بیٹھی رہی، نہ تو اس کے سینے سے آہ نکلی اور نہ ہی آنکھ سے کوئی آنسو گرا، اور نہ زبان پر کوئی افسردگی کا لفظ آیا۔ وہ بوڑھا اس طرح اطمینان سے باتیں کرتا تھا، گویا اس نے اکلوتے بیٹے اور بہو کو زمین میں دفن نہیں کیا بلکہ اپنی زندگی کا کوئی بڑا فرض ادا کیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں وہاں سے واپس آگئی۔ میں اُس بوڑھے کے ایمان کی پختگی پر حیرت زدہ تھی۔ میں بار بار سوچ کر تھک جاتی تھی مگر مجھ سے یہ معمہ حل نہیں ہوتا تھا کہ ایسی پریشانی میں بھلا کسی انسان کو یہ استقامت کیسے نصیب ہو سکتی ہے؟ پھر چند روز بعد اس کا معصوم پوتا بھی گزر گیا۔ اس اطلاع کے بعد میں بڑی بے قراری کے عالم میں اس کے پاس گاؤں پہنچی تاکہ بوڑھے کی موجودہ کیفیت کا اندازہ کر سکوں۔ مجھے یقین تھا کہ اب لاوارث بوڑھا اپنے حوصلے کی پختگی کو ختم کر چکا ہو گا اور شاید اپنے ہوا اس میں ہی نہ ہو۔ اس کا دل و دماغ مقفل ہو چکا ہو گا

اور اس کی تمام امیدیں بھی دم توڑ چکی ہوں گی۔ انہی توقعات کے ساتھ میں بوڑھے کے مکان میں داخل ہوئی اور نہایت ہی دل سوزی سے اس کے مصائب پر غم کا اظہار کیا۔ مجھے بے حد حیرت ہوئی کہ میرے اظہارِ افسوس کا بوڑھے کے دل پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے بیٹھا تھا اور نہایت ہی غیر متاثر حالت میں میری گفتگو سن رہا تھا۔ جب میری گفتگو ختم ہو گئی تو اس اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھادی اور کہا: میم صاحبہ! یہ خدا کی حکمت کے کھیل ہیں۔ اس نے جو دیا تھا وہ واپس لے لیا۔ پھر ہم اس ساتھ کے ختم ہونے پر اپنے دل کو کیوں افسردہ کریں، اللہ انکی مغفرت کرے۔ بندے پر ہر حال میں اپنے خدا کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔ ہم مسلمانوں کو یہی حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہیں۔ اب لیڈی بارس درد دل کی کیفیتوں سے لبریز تھیں۔ انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا اور روتی ہوئی آواز میں کہا: ڈاکٹر صاحب! بوڑھے کا یہ جواب میرے لیے قتل کا پیغام تھا اس کی آسمان کی طرف اٹھی ہوئی انگلی تیر بن کر میرے دل کو کرید رہی تھی۔ اس وقت میں نے اس مردِ ضعیف کی پختگی ایمان کے سامنے ہمیشہ کے لیے اپنا سر جھکا دیا کیونکہ اب مجھے یقین حاصل ہو گیا تھا کہ یہ اطمینان قلب مصنوعی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔

میں نے کہا: اے میرے بوڑھے باپ! اب تم اس گاؤں میں اکیلے رہ کر کیا کرو گے؟ میرے ساتھ ہوٹل میں چلو اور آرام سے زندگی بسر کرو۔ بوڑھے نے میری اس دعوت کا شکریہ ادا کیا اور بے تکلف میرے ساتھ ہوٹل میں چلا آیا۔ یہاں وہ دن بھر ہوٹل میں کام کرتا اور رات کو خدا کی یاد میں مصروف ہو جاتا۔ کچھ عرصے بعد اس نے کہا میں آج قبرستان جاؤں گا۔ میرے دل میں پھر وہی امتحان لینے کی کیفیت پیدا ہوئی۔ دل نے کہا کہ مجھے دیکھنا چاہیے کہ قبرستان میں اب اس کے صبر و تحمل پر کیا گزرتی ہے؟ بوڑھا ہوٹل سے نکل کر اس خاموش اور ویران مقام کی طرف آیا جہاں اس کے تینوں عزیز مدفون تھے۔ میں ایک طرف کھڑی ہو گئی اور وہ قبرستان پہنچتے ہی قبروں کی حالت کو درست کرنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ مٹی کھود کھود کر لاتا اور قبروں پر ڈالتا جاتا تھا۔ پھر اس کے بعد وہ پانی لے آیا اور ان پر چھڑکاؤ کرنے لگا۔ جب قبریں درست ہو گئیں تو بوڑھے نے وضو کیا اور اپنے ہاتھ اٹھائے اور اہل قبرستان کے حق میں دعا کی اور واپس چل دیا۔ میں نے اس تمام عرصے میں نہایت احتیاط سے اس کی تمام حرکات کو دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کے ہر کام میں اطمینان کا نور اور ایمان کی پختگی جلوہ گر ہے۔ اب میرے دل پر ایک غیبی نشتر چلا اور مجھے محسوس ہوا کہ بوڑھے کی استقامت دینِ اسلام کی بدولت ہے جس کا یہ بوڑھا پیر و کار ہے۔ اب میرے دل نے اسلام کی سچائی کو تسلیم کر لیا تھا اور میں نے اسلام قبول کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔

ہم ہوٹل پہنچے تو میں نے اُس بزرگ سے کہا کہ میں نے تمہارے دین کی سچائی کو پالیا ہے اور اب اسلام قبول کرنا چاہتی ہوں۔ تم کسی ایسی عورت بلا لاؤ جو مجھے اسلام کی تعلیم دے۔ وہ فی الفور اٹھا اور اپنے امام مسجد کی لڑکی کو بلا لایا۔ اس نے مجھے خدا اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانے کی ترغیب دی اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا سبق سکھایا۔

ڈاکٹر صاحب! یونہی میں نے کلمہ شہادت پڑھا:

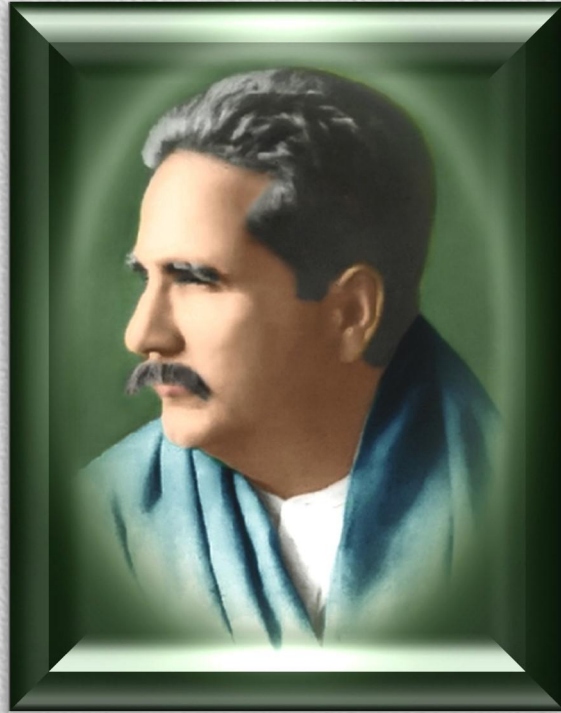
أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ

میرے دل کی کیفیت بدل گئی اور میرے احساسات میں بھی بوڑھے کی سی استقامت آگئی۔

اب میں اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت سے مسلمان ہوں اور وہی عظیم الشان قوتِ ایمان جس سے کہ بوڑھے کا دل سرشار تھا، اپنے سینے میں موجود پاتی ہوں۔ اب مجھے اپنے خدا پر اس قدر پختہ ایمان ہے کہ خواہ کس قدر بھی مصیبت آئے، میرے قدموں کو کبھی لغزش نہیں ہو سکتی۔ میں سمجھتی ہوں کہ بیشک یہ اللہ ہی کا کمال ہے کہ وہ اپنی جانب بڑھتے ہوئے قدموں میں استقامت اور دل میں پختگی پیدا کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر علامہ سر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ

کی محمد سے وفا ٹونے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں



کرنل خان محمد مٹھ ٹوانا ضلع سرگودھا کے رہنے والے تھے۔ وہ رسالدار میجر چراغ خان کے بیٹے تھے۔ یہ خاندان نسل در نسل فوج سے وابستہ تھا اور کھاتا پیتا امیر و کبیر گھرانہ تھا۔ کرنل خان محمد ڈاکٹر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے قریبی دوستوں میں سے تھے اور بڑے تہجد گزار اور پابند نماز تھے۔ کرنل خان محمد کا انتقال 29 مارچ 1945ء میں لاہور میں ہوا۔ کرنل خان محمد کے ایک دوست ڈاکٹر (پی۔ ایچ۔ ڈی) ملک عبدالغنی صاحب تھے جنہوں نے یہ کہانی سنائی۔

ملک عبدالغنی صاحب فرماتے ہیں کہ ایک روز خان محمد صاحب نے مجھے یہ کہانی سنائی: ایک شب میں تہجد کی نماز کے بعد میں آرام کی غرض سے لیٹا تو نیند آگئی۔ خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: خان محمد! اقبال کو ہمارا سلام پہنچا دینا۔ میں بھی لاہور میں مقیم تھا۔ نماز فجر ادا کر کے میں نے گاڑی نکالی اور اقبال صاحب کی رہائش گاہ پہنچ گیا جو کہ میکوڈروڈ پر واقع ہے۔ گیٹ پر انکے ملازم علی بخش سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ صاحب کو بتاؤ کہ خان آیا ہے۔ اقبال صاحب کو جیسے ہی اطلاع ملی کہ میں آیا ہوں، رات کے لباس میں چادر اوڑھے باہر آگئے۔

وہ بڑے پیار سے بولے: خان محمد! آج اتنی صبح کیسے تکلیف کی؟

میں نے کہا: ڈاکٹر صاحب! آپ کی امانت تھی جو میں زیادہ دیر رکھ نہیں سکتا تھا۔ ایک حسرت جو ہمیشہ آپ کے دل میں رہی ہے آج اللہ تعالیٰ نے اُسے پورا فرما دیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب مجھے حیران نظروں سے دیکھ رہے تھے اور اُن کا وجود میری بات سننے کیلئے بیقرار تھا۔ میں نے بھی بات کو زیادہ طول دینا مناسب نہیں سمجھا اور کہا: ڈاکٹر صاحب! "رُسول اللہ ﷺ نے آپ کو سلام بھیجا ہے" میری بات سن کر اُن پر رقت طاری ہو گئی، وہ بار بار مجھ سے سلام کے بارے میں پوچھتے رہے، یہاں تک کہ اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بن گئیں اور روتے روتے اُنکی ہچکی بندھ گئی۔ ڈاکٹر صاحب کی اس کیفیت نے مجھے بھی رُلا دیا۔ کافی دیر بعد اُنکی حالت سنبھلی۔ وہ بار بار یہی فرماتے رہے: خان محمد! تم میرے لئے ایک ایسا تحفہ لائے ہو، جس میں میرے لئے خیر و برکت ہے، اس کی قیمت کا اندازہ کسی طور پر ممکن نہیں۔ رُسول اللہ ﷺ نے جو ذرہ نوازی مجھ ناچیز پر فرمائی ہے "یہ تحفہ میری زندگی کا حاصل ہے"

ڈاکٹر سر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ دین شاعری اور فلسفہ کو خوبصورت لفظوں کی لڑیوں میں پرو دیتے تھے۔

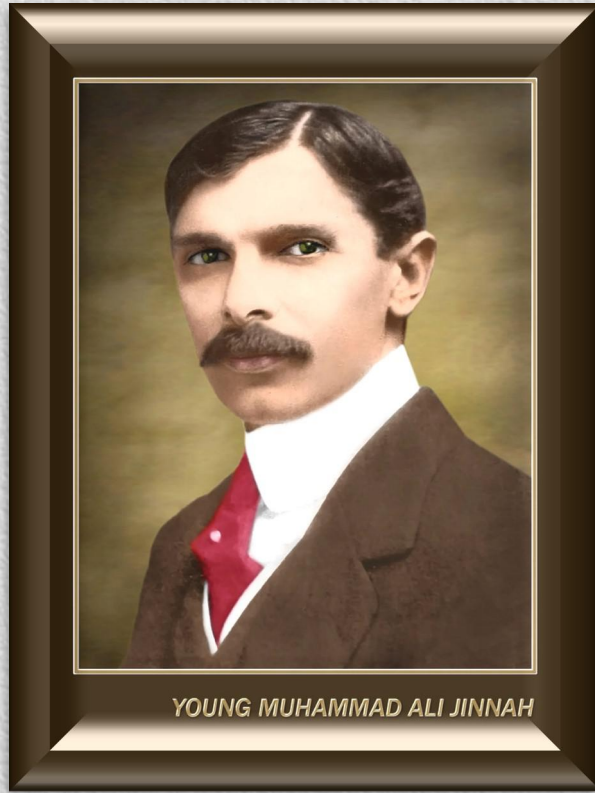
حکمتِ مشرق و مغرب نے سکھایا ہے مجھے

ایک نکتہ کہ غلاموں کے لئے ہے اکسیر

دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو

ہوتے ہیں بُختہ عقائد کی بنا پر تعمیر

قائدِ اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ



محمد علی جناح نے ابتدائی تعلیم سندھ مدرسۃ الاسلام میں حاصل کی۔ وہ بیرسٹر (وکیل) بننا چاہتے تھے۔ بیرسٹر کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے وہ انگلستان چلے گئے مگر یہ فیصلہ نہ کر پائے کہ کس تعلیمی ادارے میں داخلہ لیں۔ انہوں نے وہاں لنکزان یونیورسٹی میں دُنیا کے سو عظیم انسانوں میں محمد ﷺ کا نام سرفہرست دیکھا تو یہ بات سمجھ میں آگئی کہ غیر مسلم بھی محمد ﷺ کی سیرت و کردار کا اعتراف کرتے ہیں، انہوں نے اُسی وقت فیصلہ کیا کہ وہ لنکزان یونیورسٹی میں ہی وکالت کی تعلیم حاصل کریں گے۔

محمد علی جناح نے 1918ء میں رتی ڈنشا سے شادی کی تو پہلے اُسے مسلمان کیا اور پھر نکاح کیا۔ آپ کا نکاح مولانا ندیر احمد صدیقی نے پڑھایا جو مولانا شاہ احمد نورانی کے سگے تایا تھے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ محمد علی جناح اسماعیلی تھے تو انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اُنکا نکاح پڑھانے والے مولانا ندیر احمد صدیقی اہل سنت تھے، اور محمد علی جناح اپنے دین کے متعلق کتنے محتاط تھے؟

ایک دفعہ کسی نے محمد علی جناح سے پوچھا کہ وہ شیعہ ہیں یا سُنی؟ آپ نے نہایت تحمل سے اُس شخص سے پوچھا۔ ہادی اسلام محمد ﷺ کا مذہب کیا تھا؟ مولانا حسرت موہانی محمد علی جناح کے قریبی دوست اور تحریک پاکستان کے سرگرم رکن تھے۔ انہوں نے مالی تنگدستی کے باوجود گیارہ حج اور بارہ عمرے کئے۔ وہ محمد علی جناح کے اتنے قریب تھے کہ وہ کسی بھی وقت بلا روک ٹوک اُن سے مل سکتے تھے۔ مولانا حسرت موہانی بتاتے ہیں کہ ایک

مرتبہ وہ انتہائی صُبح کے وقت کسی ضروری کام کے سلسلے میں محمد علی جناح سے ملنے گئے۔ کافی دیر ڈرائنگ روم میں انتظار کرنے کے بعد وہ اُٹھے اور گھر کے اندر چھل قدمی کرنے لگے۔ انہیں وہاں کسی کے رونے اور سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ انہیں تجسس ہوا اور وہ کمرے کے دروازے تک پہنچے اور پردہ ہٹا کر جھانکا تو محمد علی جناح سجدے میں پڑے ہوئے گڑ گڑا کر رو رہے تھے۔ وہ سوچنے لگے کہ یہ شخص اپنے رب کے کتنا قریب ہے؟

ظہیر الاسلام فاروقی بتاتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ 1946ء میں انتخابی مہم کے سلسلے میں مولانا حسرت موہانی کیساتھ ریل میں سفر کر رہے تھے۔ مسلمانوں کے مستقبل کی بات چلی تو مولانا حسرت موہانی بولے۔ انشا اللہ پاکستان بن کر رہے گا۔ پیر علی محمد راشدی بھی شریک سفر تھے، وہ کہنے لگے: مولانا صاحب! انگریز اور کانگریس دونوں مطالبہ پاکستان کے مخالف ہیں، پھر بھی آپ اتنے یقین کے کیساتھ کیسے یہ بات کہہ رہے ہیں؟

مولانا حسرت موہانی بولے: میں یہ بات اتنے یقین کیساتھ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ پاکستان کی بشارت مجھے رسول اللہ ﷺ نے خواب میں دی تھی۔ مولانا اشرف علی تھانوی عالم دین اور مفسر قرآن تھے۔ اُن کے خواہر زادے (بھانجے) مولانا ظفر احمد عثمانی بیان کرتے ہیں۔ ایک روز تھانوی صاحب نے مجھے بلایا اور کہنے لگے: ظفر بیٹا! میں بہت کم خواب دیکھتا ہوں، مگر آج میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔ ایک بہت بڑا مجمع تھا، یوں محسوس ہو رہا تھا گویا کہ میدانِ حشر ہے۔ وہاں علماء، اولیا اور صالحین کرسیوں پر تشریف فرما تھے، ان لوگوں کے درمیان محمد علی جناح بھی تشریف فرما تھے۔ میرے دل میں خیال گذرا کہ یہ اس مجمع میں کیسے شامل ہو گئے؟ مجھے بتایا گیا کہ آجکل محمد علی جناح اسلام کی بڑی خدمت کر رہے ہیں، اسی لئے انہیں یہ فضیلت دی گئی ہے۔ 4 جولائی 1943 کو مولانا اشرف علی تھانوی نے مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا: بیٹا! 1940 کو پیش کیجانیوالی قرارداد پاکستان ضرور کامیابی کی منزل تک پہنچے گی۔ میرا آخری وقت آگیا ہے، میں اگر زندہ رہتا تو حصولِ پاکستان کی مہم میں ضرور شامل ہوتا۔ مشیتِ ایزدی یہی ہے کہ مسلمانوں کیلئے علیحدہ وطن پاکستان قائم ہو، اس لئے میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم اور تمہارے چاہنے والے قیام پاکستان کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا۔ تم میں سے ایک عثمانی میرا جنازہ پڑھائے گا اور دوسرا جناح صاحب کا جنازہ پڑھائے گا۔ مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کا انتقال ہوا تو اُن کا جنازہ مولانا ظفر احمد عثمانی نے پڑھایا اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کی وصیت کے مطابق اُن جنازہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھایا۔

1939ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے قائدِ اعظم نے فرمایا:

مسلمانو! میں نے دُنیا میں بہت کچھ دیکھا، دولت، شہرت اور عیش و عشرت کے لُطف اٹھا چکا ہوں۔ اب میری زندگی کی ایک ہی تمنا ہے کہ میں مسلمانوں کو آزاد اور سر بلند دیکھوں، اور جب میں مروں تو اس یقین اور اطمینان کیساتھ کہ میرا ضمیر اور میرا اللہ یہ گواہی دے رہا ہو کہ جناح نے اسلام سے خیانت اور غداری نہیں کی۔ میں آپ لوگوں سے کسی داد اور شہادت کا طلبگار ہر گز نہیں ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ مرتے وقت میرا دل،

میرا ایمان اور میرا ضمیر یہ گواہی دے کہ جناحؒ تم نے اسلام سے محبت کا حق ادا کر دیا اور تم نے حصولِ پاکستان کی جدوجہد کیلئے مسلمانوں کی راہنمائی کا حق ادا کر دیا۔ میرا اُحد اُمجھ سے یہ کہے کہ جناح! بیشک تم مسلمان پیدا ہوئے اور دُنیا میں جہاں کُفر کا غلبہ تھا، تم نے اسلام کا علم بلند کئے رکھ ۱۱ اور بحیثیت مسلمان ہی وفات پائی۔

قیامِ پاکستان کے بعد جب آپ گورنر جنرل بنے تو کامینہ کے دوستوں نے کہا: ہم نے اسلام کے نام پر پاکستان حاصل کیا ہے، یہاں لوگ شراب نوشی کرتے ہیں، آپ اسے روکنے کیلئے حکم نافذ کریں۔

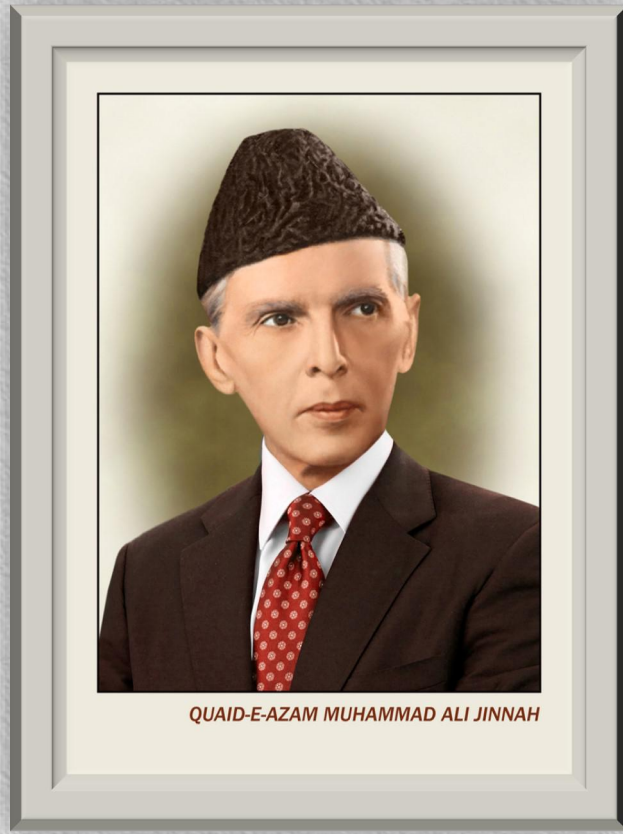
قائدِ اعظم محمد علی جناح نے جواب دیا: قرآن میں اللہ تعالیٰ نے شراب پینے سے منع فرمایا ہے۔ اُس حکم کے سامنے میرے حکم کی کیا حیثیت ہے۔ بہتر ہو گا بحیثیت مسلمان اللہ کے حکم کی پیروی کریں۔

قائدِ اعظم محمد علی جناح کو اپنی بیٹی دینا سے بہت پیار تھا۔ دینا نے ایک پارسی نوجوان نیواکل وادیا سے شادی کا فیصلہ کیا تو قائدِ اعظم محمد علی جناح نے نہ کہا کہ بیٹی تم جس بھی مسلمان لڑکے سے چاہو شادی کر لو مگر غیرِ مسلم سے نہ کرو۔ مگر دینا نے اپنے باپ کی بات نہ مانتے ہوئے پارسی نوجوان سے ہی شادی کی تو آپ نے بیٹی سے قطعِ تعلق کر لیا۔ بیٹی نے کئی ایک خطوط لکھے، آپ نے پیاری بیٹی کہہ کر مخاطب کرنے کی بجائے مسز وادیا لکھ کر ہی مخاطب کیا۔ جب آپ گورنر جنرل بنے تو اُس نے کہا کہ میں اپنے باپ گورنر جنرل سے ملنا چاہتی ہوں مگر قائدِ اعظم محمد علی جناح نے ملنے سے انکار کر دیا۔ پھر وہ آپ کی وفات پر ہی پاکستان آسکی، اور مرحوم باپ کی میت پر آنسو بہا کر واپس چلی گئی۔

قائدِ اعظم محمد علی جناح نے اپنی زندگی اسلام کے مطابق گذاری۔ ہمیشہ سچ بولا اور کبھی اللہ کے سوا کسی کے آگے نہیں جھکے۔ انگریز ہندوؤں کو اپنے آگے جھکا دیکھتے تو خواہش کرتے کہ مسلمان بھی اُنکی ایسی ہی تعظیم کریں۔ ایک مرتبہ قائدِ اعظم محمد علی جناح ایک انگریز جج کی عدالت میں پیش ہونے کیلئے کمرۂ عدالت میں آئے تو اتفاق سے اُنکا چشمہ زمین پر گر گیا۔ انگریز جج دل ہی دل میں خوش ہوا کہ چلو آج چشمہ اُٹھانے کے بہانے ہی جناح میرے آگے جھکے گا، مگر وہ حیرت زدہ رہ گیا جب قائدِ اعظم محمد علی جناح نے اپنا دوسرا چشمہ جیب سے نکال کر آنکھوں پر سجالیا۔

بیشک اللہ تعالیٰ عظیم مقاصد کیلئے عظیم لوگوں کو ہی چنتا ہے۔ یہ جناح ہی تھے کہ جنکی انگریزی زبان نہ سمجھتے ہوئے بھی لاکھوں افراد اُس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے اور اُنکی زبان سے نکلنے والے الفاظ سننے کیلئے بے چین رہتے تھے۔

قیام پاکستان اور محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ



مولانا شبیر احمد عثمانی کا شمار قائد اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ کے قریبی دوستوں میں ہوتا ہے۔ اُن کیلئے قائد اعظم کے گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی بیان کرتے ہیں کہ یہ اُس وقت کا واقعہ ہے، جب قائد اعظم نے انگلستان کو خیر باد کہہ کر بمبئی (بھارت) میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ میں قائد اعظم سے ملاقات کیلئے گیا تو قائد اعظم کو گہری سوچ میں گم پایا۔ مجھے دیکھ کر فرمانے لگے:

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ مجھے انگلستان سے واپس لوٹنے پر علامہ اقبال نے مجبور کیا اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میں لیاقت علی خان کے کہنے پر آیا ہوں۔ عثمانی صاحب! میں مانتا ہوں کہ ان دونوں دوستوں نے مجھے واپس آنے کیلئے کہا تھا مگر میرے واپس آنے کی وجہ کچھ اور ہے۔ یہ بات میں نے آج تک کسی کو نہیں بتائی اور تمہیں بھی اس شرط پر بتا رہا ہوں کہ تم اس واقعہ کا میری زندگی میں کسی سے ذکر نہ کرنا، کیونکہ لوگ بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔

قائد اعظم نے فرمایا: ایک روز میں لندن میں اپنی رہائش گاہ میں بیڈ روم میں سو رہا تھا کہ ایک جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ تھوڑی دیر بعد میں سو گیا، دوبارہ پھر جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی، یہ جھٹکا پہلے سے کہیں زیادہ تھا۔ میں بیڈ سے اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا، تھوڑی دیر بعد اطمینان کر کے واپس کمرے میں آ کر سو گیا۔ نیند میں ایک زبردست جھٹکے سے میں اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا: میرا کمرہ خوشبو سے مہک رہا تھا۔ میں نے کمرے میں کسی کی

موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے کہا:

کون ہو تم؟

جواب آیا: میں تمہارا نبی محمد ﷺ ہوں اور میں تمہیں یہ حکم دینے آیا ہوں کہ تم فوراً ہندوستان چلے جاؤ اور تحریکِ آزادی میں مسلمانوں کی راہنمائی کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور انشا اللہ آخر کار تم فتح سے ہمکنار ہو گے۔

یہ سُن کر میں نے جواب دیا: شکریہ! میرے مُحترم نبی ﷺ۔

اس واقعہ کے بعد میں نے جتنی جلدی ممکن ہو سکا۔ اپنا سب کچھ سمیٹ کر واپس لوٹ آیا۔

مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب کی قائدِ اعظم سے اتنی قربت تھی کہ پاکستان کے پہلے یومِ آزادی کا پرچم انہوں نے قائدِ اعظم کی موجودگی میں لہرایا تھا۔ قائدِ اعظم کی وفات کے بعد اُنکی نمازِ جنازہ بھی مولانا شبیر احمد عثمانی نے ہی پڑھائی تھی۔

دوستو! یہ اللہ کی رضا اور نبی کریم ﷺ کے حکم کی برکت تھی کہ پاکستان بنا تو ماہِ رمضان تھا، پھر جمعہ کا دن تھا اور ستائیسویں شب تھی۔ جو ملک اللہ کی رضا، نبی ﷺ کے حکم اور اتنی برکات کی برسات میں بنا ہو۔ اُسے دُنیا کی کوئی طاقت بھی ختم نہیں کر سکتی۔ پاکستان قیامت تک رہنے کیلئے بنا ہے اور انشا اللہ قائم رہے گا۔

اسلام میں فرقے نہیں اور فرقوں میں اسلام نہیں
مسلمان اللہ کو مانتا ہے اور مومن اللہ کی مانتا ہے
وقت سے پہلے اور مقدر سے زیادہ کبھی نہیں ملتا



زندگی سادگی سے گزارو تاکہ یوم حساب
میں آسانی ہو، مصنف کی نئی تصنیف
إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ
کا ضرور مطالعہ کریں



CONTACT: seratulmustaqeem@gmail.com

راہِ ہدایت پبلیکیشنز